مئی ۱۹۶۵ء

مدیر اعلیٰ :- نیاز فتحپوری

نگار پاکستان

قیمت فی کاپی
پچھتر پیسے

سالانہ چندہ
دس روپے

اسلام

تالیف: حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم

اسلام دُنیا کیلئے ایک تاریخ بنکر آیا ہے ایسی تاریخ جس کو تاقیامت دوام حاصل رہیگا حضور پُر نور رسول کریمؐ کی حیات طیبہ مکمل اسلام ہے اور انکی حیات طیبہ مستند انداز سے ضابطہ تحریر میں لانا آسان کام نہیں، اسکو وہی کرسکتا ہے جو صاحب دل اور بالغ نظر ہو چنانچہ حضرت مولانا نے جن کی علمی حیثیت مُسلّمہ ہے اس کام کو کماحقہٗ پُورا کرکے خراج تحسین حاصل کیا۔ ان کی یہ شہرۂ آفاق تصنیف "اسلام" سیرت مبارکہ پر اسقدر جامع و مستند کتاب ہے کہ ہر ذی علم نے اسکی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ کتاب جو پاکستان میں نایاب تھی ہم نے شرعی طور پر اجازت حاصل کرکے بہترین کتابت و خوبصورت طباعت سے آراستہ کرکے دوبارہ شائع کی ہے۔ کاغذ عمدہ گلیز سائز ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۳۹۲ صفحات۔ ھدیہ مجلد مع حسین دو رنگہ گردپوش مبلغ نو روپے۔

کرم بالائے کرم

حضرت بہزاد لکھنوی جن کی ادبی حیثیت مُسلّم اور جنکے شعری درجہ کو ہر شخص نے تسلیم کیا ہے جن کی زندگی اسلام کیلئے وقف ہے اور جنکا دل محبت رسولؐ میں ڈوبا ہوا ہے ان کی طرف سے پیش کردہ ایسی روح پرور نعتوں کا مجموعہ ہے جسکا ایک ایک لفظ دل کی گہرائیوں میں اُتر کر آپ کو محبتِ رسولؐ سے سرشار کردیگا۔ کرم بالائے کرم ایسی نعتوں کا مجموعہ ہے جو ٹوٹے ہوئے دل اور روتی ہوئی آنکھوں سے صحن حرم محراب النبیؐ اور مسجد نبویؐ میں پیش کی گئی ہیں جنکو بیت اللہ اور مسجد نبویؐ کی رُوح پرور تجلیات نے نورٌ علیٰ نور بنا دیا ہے اسکو پڑھکر آپ کا دل یقیناً اس دربار مقدس میں حاضری کیلئے بیچین ہو جائیگا جہاں کی آستاں بوسی تاجداران عالم کیلئے باعث نجات ہے۔ جہاں ملائکہ آج بھی صبح و شام درود و سلام کیلئے حاضری دیتے ہیں نظر افروز کتابت، روح پرور آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت، ہر صفحے پر خوشنما بیل، سہ رنگہ خوبصورت سرورق ھدیہ مجلد پانچ روپے کرم بالائے کرم آج ہی طلب فرما کر جاگتے میں تاجدار مدینہ کا دیدار کیجئے

رہنمائے حرمین مفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور محل میکلوڈ روڈ کراچی

حکایاتِ صحابہؓ

تصنیف حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث
اس کتاب میں آسان زبان اور حضور اور صحابہؓ کے بارے میں مفصل
انداز دلنشین ہے ایسی تصنیف کی ہوئی کتاب جسکو پڑھ
معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کیا ہوتے ہیں اور اللہ
کا خوف ہوتا ہے اور صحابہ

کی جرأت اتنا عظیم جس پر عمل ہو تو آسمان سے
کے ستاروں کی باتیں جو آپکے شغل اور کام
حکایاتِ صحابہ میں جمع کردی گئی ہیں کتابت طباعت بہترین
ومعیاری کاغذ عمدہ گلیز سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۳۰۲ صفحات
دورنگہ حسین سرورق قیمت تین روپے

فلسفۂ عبادات اسلامی

تصنیف مجاھدِ ملت مولانا عبد الحامد بدایونی

حضرت مولانا نے اسلامی عبادات کے فلسفے کو بالکل ہی اچھوتے انداز میں تحریر فرمایا ہے جملہ مسلمانوں کیلئے عموماً اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کیلئے خصوصاً بیحد مفید کتاب ہے انداز بیان اسقدر دلچسپ ہے کہ ایک ایک لفظ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں نقش ہو جاتا ہے لادینی کے موجودہ دور میں حضرت مولانا موصوف نے اس کتاب کو تصنیف فرما کر بہت ہی مفید اور نیک کارنامہ انجام دیا ہے ہر مسلمان کیلئے اس کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ کتابت طباعت خوشخط دیدہ زیب کاغذ عمدہ گلیز سائز ۲۲×۱۸/۸ ۱۴۸ صفحات دو رنگہ سرورق قیمت مجلد دو روپے ؂

کتاب غیروں کی نظر میں

تصنیف:- مجاھدِ ملت شیخ طریقت حضرت مولانا عبد الحامد بدایونی

حضرت مولانا نے دیگر مذاہب کے اکابر و مصلح حضرات کے اقوال کو بڑی محنت و کاوش سے جمع فرمایا ہے جس کے پڑھنے سے دینِ اسلام کی سچائی اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ زبان انتہائی شائستہ و سلیس اور طرز بیان بیحد دلچسپ ہے۔ کتابت و طباعت خوشخط و دیدہ زیب، کاغذ عمدہ گلیز، سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۸۰ صفحات، دو رنگہ حسین سرورق قیمت مجلد دو روپے ؂

فضائلِ صدقات

حضرت علامہ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث کی بے مثال تصنیف جسمیں صدقات کی برکات و فضلیتیں آیات قرآنی و احادیثِ نبوی سے منتخب کر کے بیحد دلچسپ انداز میں پیش کی ہیں۔ طرز بیان انتہائی پسندیدہ و مستند ہے۔ دو حصّوں میں مکمل ہے۔ کتابت انتہائی خوشخط و طباعت معیاری ہے۔ کاغذ عمدہ گلیز، سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت حصّہ اوّل ۴۴۳ صفحات حصّہ دوم ۳۸۴ صفحات قیمت حصّہ اوّل چار روپے، حصّہ دوم چار روپے پچاس پیسے ؂

رہنمائے دین مفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ مشہور محل میکلوڈ روڈ کراچی

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲ — ٹیلیفون نمبر ۴۳۶۹۳۰

مئی ۱۹۶۵ء

نگار پاکستان

مدیر اعلیٰ
نیاز فتحپوری

نائب مدیران

ڈاکٹر فرمان فتحپوری — عارف نیازی

زر سالانہ (دس روپے) = قیمت فی پرچہ (پچھتّر پیسے)

صدر دفتر:- نیاز منزل - ناظم آباد - کراچی ۱۸

شاخ:- ۳۲ - گارڈن مارکیٹ - کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی بموجب سرکلر نمبر ڈی / ایف ڈی پی ۶۶۹.۳-۶۸/۶۲ - محکمہ تعلیم کراچی

پرنٹر و پبلشر - ایم عارف نیازی نے مشہور آفسٹ پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ کراچی سے شائع کیا

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگیا

فہرست مضامین

۴۴ واں سال | مئی ۱۹۶۵ء | شمارہ (۵)

ملاحظات	متوسط طبقہ کے مشکلات	نیاز فتحپوری	۴
داغ کی حیات معاشقہ		ڈاکٹر فرمان فتحپوری	۸
آگرے کے میلے		میکش اکبر آبادی	۱۶
دہلی میں اردو		سید محمد باقر شمس	۲۹
مقامات ناصری		خان بہادر میر ناصر علی	۳۸
شہباز اور آزاد عظیم آبادی		پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی	۴۵
حسین کا قاتل کون تھا؟		نیاز فتحپوری	۵۸
تجلی التجلی		م۔ روحی اویغور کاشغری	۶۲
بعض غیر معروف فارسی شعراء		نیاز فتحپوری	۶۵
باب المراسلہ والمناظرہ	عبداللہ بن سبا (محمد مسلم عظیم آبادی)	نیاز فتحپوری	
باب الاستفسار	۱۔ کیمیا، سیمیا، ریمیا ۲۔ بعض فارسی اشعار کی تشریح	نیاز فتحپوری	۷۱
منظومات	محبوب الرحمان وامق، شفقت کاظمی سید فضا جالندھری، سید حرمت الاکرام، حفیظ نعیمی		۷۵
مطبوعات موصولہ		ادارہ	۷۸

نگارِ پاکستان کا سالنامہ ۱۹۶۵ء

جدید شاعری نمبر

(جولائی ۱۹۶۵ء میں شائع کیا جا رہا ہے)

جس میں جدید شاعری کے آغاز، ارتقاء، اسلوب، فن اور موضوعات کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی جائے گی اور اس انداز سے کہ یہ بحث آپ کو حالی و اقبال سے لے کر دورِ حاضر تک کی شعری تخلیقات و تحریکات کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی

اس کے چند عنوانات

جدید شاعری کے اولین محرکات۔ جدید شاعری کی ارتقائی منزلیں۔ جدید شاعری کی داخلی و خارجی خصوصیات۔ جدید شاعری اور اس کے اصناف۔ جدید شاعری میں ابہام و اشاریت کا مسئلہ۔ جدید شاعری میں کلاسیکل عناصر۔ جدید شاعری کی تحریکات۔ جدید شاعری کی مقبولیت و عدم مقبولیت کے اسباب۔ نظم آزاد۔ نظم معرّیٰ، سانٹ اور جدید غزل کی خصوصیات۔ جدید شاعری کے نمایاں موضوعات و رجحانات۔ جدید شاعری کا سرمایہ اور اس کی ادبی قدر و قیمت۔ وغیرہ

اردو کے تقریباً سارے ممتاز اہلِ قلم اس نمبر میں حصہ لے رہے ہیں

(خریداران نگار کو یہ نمبر مفت پیش کیا جائے گا)

ادارہ

ملاحظات

متوسط طبقہ کے مشکلات

نیاز فتحپوری

دنیا کی آبادی میں تین طبقے ہمیشہ سے متوازی چلے آرہے ہیں اور ان کی آسانیاں و دشواریاں سدا ایک ہی سی رہی ہیں گو ان کی نوعیت بدلتی رہی ہو۔ انسانی آبادی فکر و عمل کے لحاظ سے تین جماعتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک وہ جو ذہنی فکر سے کام لے کر ترقی کی راہیں متعین کرتی ہے۔ دوسری وہ جو ان ترقیوں کے اسباب فراہم کرتی ہے اور تیسری وہ جن کی قوت عمل سے ان کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔

ان تین طبقوں کو اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن میں ادنیٰ طبقہ عمال کا ہے، اعلیٰ طبقہ اہل ثروت و دولت کا اور اوسط طبقہ ان اہل علم و اہل فکر کا جو اصل بنیاد ہیں ترقی عالم کی۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جس حد تک ذہنی اطمینان، سکون اور معاشی فارغ البالی کا ہے یہی اوسط طبقہ ہمیشہ مبتلائے آلام رہا ہے اور باقی دو طبقے بڑی مطمئن زندگی بسر کرتے رہے ہیں یہ سوال بظاہر خالص اقتصادیات کا نظر آتا ہے۔ لیکن ایک حیثیت سے سیاسیات کا بھی ہے اور حکومتوں کے غور کرنے کا بھی کہ آیا ان طبقوں کے درمیان جو معاشی عدم توازن پایا جاتا ہے۔ اسے اصولاً دور ہونا چاہئے یا نہیں اور اگر انھیں دور نہ کیا گیا تو اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ جامعۂ بشری کی تاریخ میں ہمیشہ اوسط طبقہ ہی کو ملک و قوم کی (Back bone) ریڑھ کی ہڈی قرار دیا گیا ہے، لیکن کس درجہ افسوسناک بات ہے کہ آج تک ہم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ اگر کسی وقت یہ ریڑھ کی ہڈی بیکار ہو گئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

اس موضوع پر روزنامہ قومی آواز لکھنؤ نے ایک بڑا سلجھا ہوا اداریہ شائع کیا ہے جو نہ صرف بھارت بلکہ پاکستان اور تمام ان ممالک پر بھی منطبق ہو سکتا ہے کہ جو اپنی ترقی کے لئے منصوبہ بندیوں میں تو مبتلا ہیں، لیکن اس سے بالکل بے خبر ہیں کہ جو طبقہ صحیح معنی میں ان منصوبوں کو پورا کر سکتا ہے وہ خود کس قدر بدحال ہے اور زندگی کے کس دردناک دور سے گزر رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اوسط طبقہ کی زبوں حالی پہ ماتم تو بھارت میں بھی کیا جاتا ہے اور پاکستان میں بھی لیکن اسکو معاشی کی طرف سے مطمئن کر دینے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔

بقول اڈیٹر قومی آواز اسی طبقہ نے ہمیشہ مفکر و دانشور اور ماہرین علم و فن پیدا کئے، لیکن وہی ہمیشہ مجبور و پریشان حال رہا، برطانوی حکومت میں بھی اور برطانوی حکومت سے آزاد ہو جانے کے بعد بھی۔

آمدنی کے اضافہ اور معیار زندگی بلند کرنے کے لئے حکومتوں کی طرف سے جو صورتیں پیدا کی جاتی ہیں وہ سب ایسی ہیں جن سے صرف اونچے طبقے والے لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کو فائدہ پہنچتا ہے یا نیچے طبقے والوں کو اور اوسط طبقہ محروم رہجاتا ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے۔ اس کا سمجھنا کوئی ایسی مشکل بات نہیں۔ نیچے طبقے والے وہ ہیں جو محنت مزدوری کرکے اپنی آمدنی میں تو اضافہ کرلیتے ہیں لیکن انکا معیار زندگی وہی رہتا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور اس طرح ان کی زندگی بڑے آرام وسکون سے گزر جاتی ہے۔ یہ نہ اچھے کپڑے پہننے کے شوقین ہوتے ہیں اور نہ کھانے پینے میں وہ اپنی حد سے آگے بڑھتے ہیں۔ اسی طرح ان کی گھریلو زندگی بھی بالکل سادہ ہوتی ہے اور منبر و کرسی۔ فرش و فروکش کی ٹیم ٹام میں بھی وہ پیسہ ضائع نہیں کرتے۔ بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں بھی وہ زیادہ حوصلہ مند نہیں ہیں۔ کتابوں کی تعلیم سے زیادہ وہ گھر کی فنی تعلیم کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ متوسط طبقے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکوں کا جو حشر ہوتا ہے اسے وہ جانتے ہیں کہ مہینوں کی دوا دوش کے بعد بھی انھیں سو روپیہ کی نوکری نہیں ملتی۔ برخلاف اس کے خود ان کے بچے چار پانچ سال کی گھر کی فنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی کمانے لگتے ہیں۔

الغرض ادنیٰ طبقہ کے لوگ بہت سی فکروں سے آزاد ہیں اور باوجود اس کے کہ زندگی کی ضروریات انھیں بھی کافی گراں پڑتی ہیں۔ وہ اس تنگی کو زیادہ محسوس نہیں کرتے کیونکہ ان کی اجرت کارکردگی بھی تگنی چوگنی ہوگئی ہے۔ اور انھیں زمانے سے کوئی شکایت نہیں۔

اونچے طبقے کے دولتمند لوگوں کی نہ پوچھئے کہ انھیں دنیا کا ہر آرام حاصل ہے۔ اور ان کی کوئی خواہش خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز ایسی نہیں جسے وہ پورا نہ کرسکتے ہوں، آراستہ حویلیوں میں رہتے ہیں، ہر ہر کام کے لئے ایک علیحدہ ملازم موجود ہے، نقل و حرکت کے لئے کئی کئی موٹر کاریں ہیں۔ اسباب تفریح کی فراوانی ہے اور باوجود اشیاء کی گرانی کے ہر چیز ان کے لئے ارزاں ہے۔ ان کو اگر کوئی فکر ہے تو صرف یہ کہ وہ لکھ پتی سے کروڑ پتی اور کروڑ پتی سے ارب پتی کیونکر بن سکتے ہیں۔ وہ اگر اپنی اولاد کی تعلیم پر روپیہ صرف کرتے ہیں تو وہ بھی حصول علم کی غرض سے نہیں بلکہ محض اس اظہار تفاخر کے لئے کہ ان کی اولاد لندن، امریکہ، فرانس یا جرمنی کی تعلیم یافتہ ہے۔ خواہ انھوں نے غیر ممالک میں جاکر خاک ہی کیوں نہ چھانی ہو — چنانچہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہیں ایک دولت مند گھرانا ایسا ہے۔ جو رہتا ہے کراچی میں اور اس کے بچے تعلیم پاتے ہیں لاہور میں لیکن اس شان و طمطراق کے ساتھ کہ ذاتی ہوائی جہاز کے ذریعہ سے وہ روزانہ صبح کو لاہور جاتے ہیں اور شام کو کراچی واپس آجاتے ہیں۔ اس طبقہ کی فراوانی دولت نے جو عدم توازن ہمارے معاشرے میں پیدا کردیا ہے وہ بڑا اہم سوال ہے لیکن اس کا دور ہونا، اسے اوسط طبقہ کے معیار زندگی تک کھینچکر نیچے آنا بہت دشوار ہے اور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک معاشرہ کا سارا نظام کسی ایک سطح مستوی تک نہ لے آیا جائے۔ بہر حال اس وقت ادنیٰ و اعلیٰ طبقہ۔ دونوں طبقے کافی اطمینان وسکون کی زندگی بسر کررہے ہیں، لیکن اوسط طبقہ بڑی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ کیونکہ اس کے مصارف زندگی و معاشرت قریب قریب اتنے ہی ہیں جتنے امراء کے لیکن ان کی آمدنی کا اوسط ادنیٰ طبقہ کی اوسط آمدنی سے بھی کم ہے۔ پھر اسی کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اوسط طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ملک کی ترقی کی اصل بنیاد ہیں تو ہمارے احساس کو اس سے سخت چوٹ لگتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ طبقہ ہے علماء کا، ادیبوں کا، مصنفین کا، مفکرین کا۔ مقررین کا، پروفیسروں کا، علمی تحقیقات میں مشغول رہنے والوں اور معلمین اخلاق کا۔ لیکن صرف چند افراد کو چھوڑ کر

ان میں کوئی ایسا نہیں، جسے ہم صحیح معنی میں مسرور و مطمئن کہہ سکیں ۔ اور جو اپنی اور اپنی اولاد کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو ان لوگوں کی آمدنی کا اوسط زیادہ سے زیادہ شہر کراچی میں تین چار سو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں چند افراد کا ماہانہ مشاہرہ تین چار ہزار روپیہ ہو ۔ اور بعض کا ہزار دو ہزار، لیکن اکثریت انھیں افراد کی ہے جن کی آمدنی سد رمق سے زیادہ نہیں اور اس طرح خود طبقۂ اوسط میں بھی معاشرہ کا اونچ نیچ پیدا ہوگیا ہے ۔ ——— اور یہ اچھی علامت نہیں کیونکہ اس سے ثقافتی معیار کا متاثر ہونا ضروری ہے ۔ جس سے رفتہ رفتہ دونوں کا ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا مستبعد نہیں اور یہ بات اجتماعی نقطۂ نظر سے بری ہے

اس میں شک نہیں کہ ہمارا متوسط طبقہ ایک حد تک خود بھی اپنی پریشانیوں کا ذمہ دار ہے کیونکہ اس نے امرا کی تقلید میں بہت سے غیر ضروری اور مسرفانہ عوائد اپنے اوپر عائد کر لئے ہیں اور وہ صاف ستھری زندگی کا صحیح مفہوم فراموش کر چکا ہے ۔ مثلاً وہ اہل ثروت کی تقلید میں اپنی حیثیت سے زیادہ اپنے لباس پر صرف کرتا ہے بہ سلسلۂ لطف و تفریح دو سینما بھی جاتا ہے، شراب بھی پی لیتا ہے اور اپنی آمدنی کا کم از کم دس فیصدی حصہ سگرٹ اور پان پر ضائع کر دینا تو کوئی بات ہی نہیں ۔ الغرض ہمارے متوسط طبقے کی بدحالی کا ایک سبب یقیناً خود اس کی مذموم عادات بھی ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اس باب میں حکومت بھی کوئی اصلاحی قدم نہ اٹھائے ۔ کیونکہ جس طرح دوسرے مسائل معاشرہ کی تدابیر پر غور کرنا اس کا فرض ہے ۔ اسی طرح متوسط طبقہ کی مشکلات کو دور کرنا بھی اس کا اہم فریضہ ہے ۔

اس باب میں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ جس طرح روزانہ اور بہت سی کمیٹیاں بنائی جاتی، اسی طرح ایک کمیٹی متوسط طبقہ کی اصلاح و خوشحالی کے لئے بھی بنا دی جائے اور اس طبقہ کا تفصیلی جائزہ لیکر یہ دیکھا جائے کہ ان کی وہ کونسی مشکلات ہیں جن کو وہ خود دور نہیں کر سکتے بلکہ حکومت ہی ان کا ازالہ کر سکتی ہے ۔ مثلاً اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال بچوں کی تعلیم کا ہے جو غیر معمولی مصارف کی وجہ سے قطعاً اس طبقہ کے اکثر افراد کے بس کی بات نہیں ۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم اور فراہمی کتب کی ذمہ داری حکومت اپنے سر لے اور وہ طلبہ جو ذہنی حیثیت سے ترقی کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں ان کو وظائف دے کر اعلیٰ تعلیم دلانے کا انتظام کرے ۔ دوسرا سوال طبی امداد کا ہے اور یہ بھی یقیناً ان کے بس سے باہر ہے اس لئے ان کے مفت علاج کا بھی انتظام ہونا چاہئے ۔ تیسری بات جو میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے ۔ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نوکری کا تصور ان کے دماغ سے دور کیا جائے اور امداد باہمی کے طور پر سرمایہ فراہم کر کے انھیں صنعت و تجارت کی طرف مائل کیا جائے ——— ایک بات اور وہ یہ کہ اگر ٹیکس سے انھیں مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا تو اس کی شرح بہت کم کر دی جائے اور قابل ٹیکس آمدنی کے حدود کو زیادہ وسیع کر دیا جائے ۔ یہ ہیں بظاہر وہ چند صورتیں جن پر حکومت کو غور کرنا چاہئے لیکن اگر حکومت دردسری مول لینے پر آمادہ نہ ہو تو پھر میں اسی طبقے کے لوگوں سے یہ پوچھوں گا کہ آیا انھوں نے خود بھی کبھی اس پر غور کیا ہے کہ ان کی مشکلات خود ان کی پیدا کی ہوئی ہیں اور کیا ان کے لئے ممکن نہیں کہ زندگی کے تمام غیر ضروری بلکہ مضرت رساں مشاغل ترک کر کے خود ہی اس بوجھ کو ہلکا کریں اور صاف ستھری زندگی بسر کرنا سیکھیں ۔ وہ بلند و پاکیزہ باعمل زندگی جو ورثہ ہے اکابر اسلام کا اور خلاصہ ہے اس تعلیم کا جس نے قوموں کی تقدیریں پلٹ کر رکھ دیں ۔ اسراف سے بچنے کے لئے علمائے اخلاق میں غزالی نے ایک بڑا مفید و کارآمد نکتہ پیش کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ

شخص کو روز یہ غور کرنا چاہیے کہ اس نے دن بھر میں کتنی غیر ضروری خواہشوں پر کس قدر روپیہ ضائع کیا ہے اور اسے عہد کرنا چاہیے کہ آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گا ۔ اس کی ایک آسان نفسیاتی تدبیر یہ ہے کہ جب کسی چیز کے حصول کی خواہش ہمارے دل میں پیدا ہو تو ہم کو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ کیا اس چیز کے بغیر ہم زندگی بسر کر سکیں گے اور عقل کا فیصلہ یہ ہو کہ ہم اس کے بغیر بھی زندگی بسر کر سکتے ہیں، تو پھر قطعاً اس سے روگردانی اختیار کر لینا چاہیے اور یہی وہ نکتہ ہے جسے بیدل نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ :-

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب جہاں
انچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست

نگارِ پاکستان کا خصوصی شمارہ

ماجدولین نمبر

فرانسیسی ادبِ لطیف کا فسانہ نہیں بلکہ وہ دلدوز تاریخی رومان جسکی نظیر
کسی زبان کے ادب میں نظر نہ آئے گی !

★ اُسے پہاڑوں نے سُنا اور کانپ اُٹھے
★ زمین نے سُنا اور تھرا اُٹھی ۔
★ خدا نے سُنا اور تادیر ملول رہا ۔
★ جسے روح سنتی ہے اور آنسوؤں سے نہا کر نئی طہارت و پاکیزگی حاصل کرتی ہے ۔

محبّت کا خراج

صرف وہ آنسو ہیں جو دل سے اُمنڈتے ہیں اور آنکھوں سے بے اختیار جاری ہو جاتے ہیں

اور ممکن نہیں

یہ سانحہ پڑھ کر آپ یہ خراج ادا کرنے پر مجبور ہو جائیں

قیمت — تین روپے

منیجر:- نگار پاکستان ۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ ۔ کراچی ۳

داغ کی حیاتِ معاشقہ

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

میر تقی میر، اور مومن خاں مومن کی طرح داغ دہلوی نے بھی اپنی عاشقانہ زندگی سے متعلق ایک طویل مثنوی "فریادِ داغ" یادگار چھوڑی ہے۔ "فریادِ داغ" صرف یہی نہیں کہ سوانحِ داغ کے بعض اہم پہلوؤں کو داشگاف کرتی ہے بلکہ ان کی طبیعت کے میلان اور میلان کے شاعرانہ انعکاس کو سمجھنے میں بھی اس سے مدد ملتی ہے۔

یہ مثنوی جسے داغ کی منظوم آپ بیتی خیال کرنا چاہیے۔ ۱۸۸۲ء میں لکھی گئی اور چند دن بعد ۱۸۸۳ء میں شائع ہوگئی بایں ہمہ، اردو کے عام ناقدین و مورخین کی نظر سے بہت دنوں پوشیدہ رہی لیکن جب داغ ہی کے ایک لائق شاگرد تمکین کاظمی اسے ازسرِنو منظرِ عام پر لے آئے تو یہ داغ کی زندگی اور ان کی شاعری کا ایک قابلِ مطالعہ باب بن گئی۔

داغ کے معاشقے کا سلسلہ یوں شروع ہوتا ہے کہ ۱۸۸۱ء یعنی قیامِ رامپور کے زمانے میں۔ داغ دہلوی بے نظیر کا میلہ دیکھنے گئے اور وہاں کلکتے کی ایک طوائف منی بائی حجاب پر عاشق ہو گئے ؎

آگیا بے نظیر کا میلا — دل پابندِ وضع کھُل کھیلا
جلوہ دیکھا جو حور طلعت کا — سامنا ہو گیا قیامت کا
دیکھ کر اس پری شمایل کو — رہ گیا تھام تھام کر دل کو

اس ملاقات کے بعد داغ نے منی بائی حجاب سے رسم و راہ بڑھائی اور بے تکلف صحبتوں کے موقعے نصیب ہو گئے۔ فقرے بازی اور چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ؎

سادگی میں بناوٹیں کیا کیا — اکھڑی اکھڑی حکایتیں کیا کیا
شعبدے لاکھ لاکھ آفت کے — فقرے چلتے ہوئے قیامت کے
کبھی چبھتی ہوئی سنا دینا — سن کے تعریف مسکرا دینا
سخنِ ناصواب کہہ دینا — مجھ کو خانہ خراب کہہ دینا
وعدہ کرتے ہی مسکرا دینا — چٹکیوں میں مجھے اڑا دینا
ایک اک دم میں سو دارائیں — لطف کے دن وہ عیش کی راتیں
کبھی شعر و سخن کا چرچا تھا — کبھی اپنے وطن کا چرچا تھا
رات کتنی ہنسی خوشی کیا کیا — ہوتی رہتی کھلی دلی کیا کیا

جاں نوازی پر اس کو ناز بھی تھا
بے نیازی میں کچھ نیاز بھی تھا

خانۂ دوست عیش خانہ تھا
ہائے کیا دن تھے کیا زمانہ تھا

یہ محفل عیش و نشاط زیادہ دنوں برقرار نہ رہ سکی۔

عیش یہ آسماں نہ دیکھ سکا
چار دن شادماں نہ دیکھ سکا

اور حجاب نے رام پور سے اپنے وطن کلکتہ جانے کا قصد کیا۔

قصہ ٹھہرا وطن کے جانے کا
رنگ بدلا نیا زمانے کا

یہ جدائی دونوں کو شاق تھی۔ لیکن چارۂ دل سوائے صبر نہ تھا۔ اس لئے رسم الفت نبھانے کے اقرار ہوئے۔ عہد وفا کو پورا کرنے کی قسمیں کھائی گئیں اور خط و کتابت کے ذریعے یاد تازہ رکھنے کی تجویزیں پیش ہوئیں۔

ٹھہرے عہد وفا جو آپس میں
کھائیں باہم ہزار ہا قسمیں

رسم الفت کے ہو گئے اقرار
خط کتابت کے ہو گئے اقرار

اس موقع پر داغ کی بے قراری نے محبوبہ کو بھی حد درجہ متاثر کیا اور اس نے زہر عشق کی ہیروئن کے انداز میں داغ کو تسلیاں دینا شروع کیں۔

آتے جاتے ہیں سب خدائی میں
مر نہ جانا مری جدائی میں

جان سی چیز یوں نہیں کھوتے
اس قدر پھوٹ کر نہیں روتے

جب کہ رنج و ملال ہوتا ہے
سچ ہے ایسا ہی حال ہوتا ہے

زندگی شرط ہے تو آئیں گے
لطف صحبت کے پھر اٹھائیں گے

دل سے نزدیک ہم ہیں دور نہیں
اس قدر دور رام پور نہیں

یاد رکھنا ہمیں یہ یاد رہے
اسی صورت سے اتحاد رہے

مصرعۂ میر پڑھ کے فرمایا
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

داغ کی عمر اگرچہ اس وقت پچاس سے اوپر تھی اور ان میں جوانوں کی سی حرارت و گرمی باقی نہ تھی پھر بھی چونکہ وہ شاعر تھے اور خالص غزل کے شاعر تھے۔ اس لئے ان کا جذباتی ہونا ضرور تھا۔ حجاب کی جدائی میں ان کے اضطراب و بے قراری کا یہ عالم ہو گیا دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی۔ رات دن سوتے جاگتے۔ اٹھتے بیٹھتے حجاب کے خیال میں ڈوبے رہتے۔ ہر آنے والے پر حجاب کی آمد کا گمان ہوتا نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب کوئی مہمان آتا تو داغ اس کو حجاب کا پیامبر خیال کر کے تلاشی لیتے کہ شاید کوئی نامہ و پیام لایا ہو۔ اور عالم دیوانگی میں حجاب کی خیر و عافیت پوچھنے میں عجب عجب سوال کرتے۔

اب کہاں وہ صفائیاں منہ پر
چھٹ رہی ہیں ہوائیاں دل پر

جتنے ارمان ہیں مرے دل میں
سب وہ پیکان ہیں مرے دل میں

مگر افشائے راز سے خاموش
کبھی کچھ ہوش میں کبھی بے ہوش

کوئی مہماں جو مرے گھر آیا
میں نے جانا پیامبر آیا

لیں بلائیں ہزار بار میں نے
دیں دعائیں ہزار ہا میں نے

اس کو باتوں میں ٹٹولتا تھا میں — خط کمر میں ٹٹولتا تھا میں

خبر یار پوچھتا تھا میں — حال اغیار پوچھتا تھا میں
رنگ کیا ہے امیدواروں کا — ڈھنگ کیا ہے صلاح کاروں کا
کون سے شخص پر عنایت ہے — رات دن کس سے گرم صحبت ہے
سنتے ہیں داستان ہجر کہ نہیں — یاد آتے ہیں ان کو ہم کہ نہیں
بزم آرائیوں کا شوق بھی ہے؟ — ابھی شعر و سخن کا ذوق بھی ہے؟
ہیں طبیعت کے ولولے کیا کیا — رات دن کے ہیں مشغلے کیا کیا
میزباں سن کے یہ مری تقریر — تھا تحیر میں صورت تصویر
اس کو حیرت یہ ماجرا کیا ہے — میزباں کو جنوں ہے سودا

غرض داغ کو حجاب کی جدائی کا بڑا قلق تھا۔ انھوں نے اسے لاکھ بھلانا چاہا مگر بھلا نہ سکے وعدے کے مطابق خط کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور اگلے سال ۱۸۸۲ء میں داغ نے میلا دیکھنے کے بہانے حجاب کو پھر بلا بھیجا۔

صورت نامہ و پیام رہی — خط کتابت کی دھوم دھام رہی
ان کو لکھا بطور استمزاج — سارے میلوں سے ہے یہ بڑھ کر آج
دیکھو تم بے نظیر کے جلسے — ہر برس ہو شریک اول سے
کچھ رہو رام پور میں آکر — لطف اٹھاؤ حضور میں آکر

منی بائی حجاب نے پہلے تو حیلہ حوالہ کیا لیکن آخر کار دعوت قبول کر لی۔ اور ایک سال بعد بنارس ہوتی ہوئی پھر رام پور پہنچ گئیں۔ حجاب کا رامپور پہنچنا گویا داغ کی عمر رفتہ کا واپس آنا تھا۔

جا کے عہد شباب کا آنا — تھا دوبارہ حجاب کا آنا
پھر وہی ساعت سعید آئی — کہ برس دن کے بعد عید آئی
نکہت گل ادھر پلٹ آئی — عمر رفتہ مگر پلٹ آئی

اس دفعہ منی بائی حجاب اپنی چھوٹی بہن حمیدن بائی نقاب[1] کے ساتھ آئیں اور چونکہ نواب کلب علی خاں کے چھوٹے بھائی نواب حیدر علی خاں سے مراسم خاص تھے اس لئے انھیں کے ہاں ٹھہریں۔ اور داغ سے بے تکلفانہ ملنے کے بجائے تکلف سے ملیں اور وضعداری کا بہانہ کرکے کچھ دنوں داغ کو ٹالتی رہیں۔

آئے لیکن ہزار ناز کے ساتھ — ملے مجھ سے تو احتراز کے ساتھ
وہم بھی بے قیاس تھا ان کو — پاس والوں کا پاس تھا ان کو
لے لی چٹکی سے دل میں چٹکی بھی — پھر تشفی بھی اور تسلی بھی
پہلے کچھ بات کی تو رک رک کر — پھر کہا میرے کان میں جھک کر

---

[1] حمیدن بائی نقاب بھی شاعرہ تھیں اور اپنی بہن حجاب سے مشورہ کرتی تھیں تذکرہ بہارستان ناز اور تذکرۃ النساء وغیرہ میں ان کا ذکر آیا ہے۔

کیا نہیں حسرتِ وصال ہمیں	وضعداری کا ہے خیال ہمیں

داغ کو حجاب اور نواب حیدر علی خاں کی صحبتیں سخت گراں گزریں اور وہ حجاب سے بدگمان ہونے لگے۔ اب انھیں یہ معلوم کرنے کی فکر ہوئی کہ خود نواب صاحب حجاب کے دلدادہ ہیں یا حجاب خود نواب صاحب کی طرف مائل ہے چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں حجاب کو خط لکھا اور جب حجاب نے لکھا کہ میں نواب صاحب کے پاس اپنی خوشی سے نہیں گئی تو انھوں نے اپنے ایک دوست کے ذریعے نواب صاحب کو کہلوایا کہ "داغ حجاب کے تیر نظر کا بے طرح گھائل ہے۔ آپکی دلبستگی کے لئے اور بھی سامان ہیں لیکن بے چارہ حجاب کو نہ پائے تو کہاں جائے اور اگر مل جائے تو وہ پھانس جو دل میں پیوست ہے کیسے دور ہو؟" جب یہ پیغام نواب صاحب کو دیا گیا تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ حجاب میری طرف سے آزاد ہیں جہاں چاہیں جاسکتی ہیں۔ جب نواب صاحب کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو داغ نے حجاب کو خط لکھا اور بڑی جلی کٹی سنائی۔ حجاب پر اس تحریر کا خاطر خواہ اثر ہوا اور داغ کے لفظوں میں ؎

پھر تو وہ بوٹ کر ادھر آئے	دام سے چھوٹ کر ادھر آئے

ساری رنجشیں دور ہو گئیں اور گزشتہ بے رخی و بے اعتنائی کا ذکر چھیڑے بغیر دو مہینے عیش و راحت میں گزرے اور بظاہر حجاب ان کے قبضے میں آگئیں ؎

آگے کیا اپنے ذکر چھیڑوں میں	گڑے مردے عبث اکھیڑوں میں
گزرے اوقات عیش و عشرت سے	دو مہینے تک ایک صورت سے
دوست اپنا وہ مجھ کو جان گئے	میرے کہنے کو دل سے مان گئے

لیکن کچھ دنوں بعد پھر ان بن ہو گئی اور حجاب یکایک کلکتہ واپس جانے کے لئے تیار ہو گئیں پھر بھی حجاب نے اپنی خفگی کا اظہار نہیں ہونے دیا اور جاتے جاتے داغ کو ہر طرح کا اطمینان دلا گئیں۔

بولی میری بلا تفس میں رہے	آدمی کیوں پرائے بس میں رہے
قید خانہ ہے دام پدر سے مجھے	جلد رخصت کریں حضور مجھے
پھر وہ سمجھے یہ مر ہی جائے گا	ڈوب جائے گا زہر کھائے گا
آؤ اسکی تسلیاں کر دیں	جی میں جو کچھ ہے وہ بیاں کر دیں
مجھ سے کہنے لگے سنو صاحب	اس قدر مضطرب نہ ہو صاحب
صبر کا پھل ضرور پاؤ گے	اس کی راحت بہت اٹھاؤ گے
دم دلاسے وہ مجھ کو دے کے گئے	مجھ سے آنے کا وعدہ کر کے گئے

لیکن حجاب کا جانا داغ کے لئے قیامت کا آنا تھا۔

صبح کو وہ ادھر سوار ہوئے	ہم اجل کے امید وار ہوئے

حجاب کلکتہ پہنچی تو لوگوں نے طرح طرح سے داغ کے خلاف بھڑکایا۔ اور حجاب کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ داغ

۱؎ فریاد داغ مرتبہ تمکین کاظمی ص ۴۵

کو کلکتہ آنے کی دعوت دے کر اُن کے عشق صادق کا امتحان لیں۔ اگر انھیں واقعی محبت ہوگی تو دوڑے چلے آئیں گے ورنہ کوئی عذر پیش کردیں گے ؎

بنے خوبی مرے نصیبوں کی ۔۔۔ کہ بن آئی وہاں رقیبوں کی
یہ لگایا، بلاؤ تو اُن کو ۔۔۔ تم کبھی آزماؤ تو اُن کو
دیکھیں کیسے ہیں چاہنے والے ۔۔۔ رسم الفت نبھانے والے
کتنے پانی میں ہیں ذرا دیکھو ۔۔۔ وہ نہ آئیں گے تم بلا دیکھو
چاہتے ہیں تو اُڑ کے آئیں گے ۔۔۔ ورنہ ہر طرح ہچکچائیں گے

چنانچہ حجاب نے داغ کو خط لکھا اور اپنی بے قراری و بے تابی ہجر کا بہانہ کرکے داغ کو کلکتہ بلا بھیجا۔

مجھ کو گھر کھا اے مرے بیتاب ۔۔۔ دن کو بے چین رات کو بیخواب
ہم نئی بات روز سنتے ہیں ۔۔۔ تازہ اک واردات سنتے ہیں
کوئی کہتا ہے بے قرار تمھیں ۔۔۔ کوئی کہتا ہے اشکبار تمھیں
کوئی کہتا ہے چپ لگی ہے انھیں ۔۔۔ سخت دشوار زندگی ہے انھیں
کھاتے ہیں پیتے ہیں نہ سوتے ہیں ۔۔۔ مفت رو رو کے جان کھوتے ہیں
سن کے یہ حال ہر زباں سے ہم ۔۔۔ لائیں پتھر کا دل کہاں سے ہم
یاد ہے قول اس زمانے کا ۔۔۔ تم نے وعدہ کیا تھا آنے کا
رسم الفت بھلاتے ہو اگر ۔۔۔ جان کی خیر چاہتے ہو اگر
اٹھ کے سیدھے ادھر چلے آؤ ۔۔۔ کوئی رو کے مگر چلے آؤ
میہماں تم ہو میزباں ہم ہوں ۔۔۔ عیش و عشرت کے لطف باہم ہوں

اندھا کیا مانگیں دو آنکھیں۔ داغ کی دلی مراد بر آئی۔ وہ حجاب کی پہلی کج ادائیاں اور بے وفائیاں یکسر بھول گئے اور قصد سفر کیا۔ اور حجاب کو لکھ بھیجا ؎

تم بلاؤ نہ آؤں کیا ممکن ۔۔۔ ہے سراسر یہ بات ناممکن

چنانچہ داغ نے نواب صاحب کی خدمت میں تبدیل آب و ہوا کا بہانہ کرکے رخصت کی درخواست دی اور رامپور سے دلی، دلی سے لکھنؤ پہنچے۔ سید بہادر حسین انجم نیشاپوری کے یہاں قیام کیا۔ پھر کانپور والہ آباد ہوتے ہوئے عظیم آباد پہنچے۔ یہاں ان کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ آٹھ دن میر باقر کے یہاں مقیم رہے۔ اس کے بعد کلکتہ کو روانہ ہوئے۔ کلکتہ میں ناخدا کی مسجد کے قریب ایک پُر فضا کشادہ مقام پر ٹھہرے اور چند دن حجاب کی صحبت میں عیش و راحت کے بسر کئے۔

بخت بیدار و یار ہے دمساز ۔۔۔ اے شب وصل تری عمر دراز
صبح سے شام تک جمال کے لطف ۔۔۔ شام سے صبح تک وصال کے لطف
عیش سا عیش تھا نصیبوں میں ۔۔۔ کھلبلی پڑ گئی رقیبوں میں

یکایک نواب صاحب کے پاس سے داغ کی طلبی کا خط پہنچا۔ اور داغ کو چار و ناچار رامپور واپس ہونا پڑا۔ حجاب کو بھی داغ

کے چھٹنے کا بڑا قلق ہوا۔

مری رخصت سے ان کو حیرت تھی — کہ یہ رخصت نہ تھی قیامت تھی
فکر تشویش، رنج تھا غم تھا — عوض نغمہ شور ماتم تھا
اشک آنکھوں میں ڈبڈبا آئے — پاس بیٹھے تو منھ بنائے ہوئے
وہ جو گھبرائے مرے اف اف سے — تو یہ کہنے لگے تاسف سے
چند وابستہ ہیں ہمارے ساتھ — ورنہ ہو لیتے ہم تمھارے ساتھ
تم کبھی تنہا نہیں ستم یہ ہے — چھوٹتا ہے یہ ساتھ غم یہ ہے
جو میرے پاس ہے تمھارا ہے — تم کو لیکن یہ کب گوارا ہے

گویا حجاب نے داغ کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ داغ بڑے دوررس اور مصلحت کوش عاشقوں
ں تھے۔ عشق و عاشقی کو نواب صاحب کے حکم پر ترجیح کیسے دے سکتے تھے۔ چنانچہ حجاب کے ان آزمائشی فقروں کو ے

جو مرے پاس ہے تمھارا ہے
تم کو لیکن یہ کب گوارا ہے

اموشی سے مان گئے۔

میں نے کی اختیار خاموشی — مجھ سے کب ہو نمک فراموشی

داغ نواب صاحب کے سچے نمک خوار تھے۔ حکم عدولی کی تاب کہاں سے لاتے۔ حجاب سے جدا ہونے پر مجبور
گئے اور ریل کے دو روزہ سفر کے ذریعہ جولائی ۱۸۸۲ء اخر کلکتہ سے رامپور پہنچ گئے۔ حجاب کی جدائی کا داغ ایک مدت
ں دل میں لئے رہے اور جیسا کہ ذیل کے ان دو شعروں سے ظاہر ہے۔ غم فراق کی سختی سے برسوں نجات نہ پا سکے۔

یاالٰہی نجات غم سے ملے — وہ سراپا حجاب ہم سے ملے
ورنہ اس کا خیال کبھی نہ رہے — اب ہے جیسا یہ حال کبھی نہ رہے

پوری مثنوی میں کوئی ساڑھے آٹھ ہزار اشعار ہیں اور جیسا کہ اوپر کے اقتباسات سے ظاہر ہے اس میں حسن و عشق
چھیڑ چھاڑ اور زبان و بیان کی بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔ مثنوی کے بعض ٹکڑے بڑے خوبصورت ہیں۔ کہیں کہیں جذبات
سچی تصویریں ہیں۔ کہیں محاکات کا لطف ہے کہیں روزمرے کا چٹخارہ ہے۔ کہیں سہل ممتنع کی حسن کاری ہے۔ اور کہیں کہیں
ب وصال و شب فراق کی دلکش و نظرگیر مصوری ہے۔ بایں ہمہ محبت کی وہ متنوع کیفیات، جن کا تعلق جذبات کی شدت
ایک سچے عاشق کی شیفتگی و سپردگی سے ہے، نظر نہیں آتیں۔ میر، مومن اور نواب مرزا شوق کی منظوم عشقیہ داستانوں
جذبہ کی صداقت، شدت، گہرائی اور تنوع ساری چیزیں ہیں۔ اس کے برعکس داغ کے جذبات ہلکے پھلکے اور رنگین ہیں۔ غالباً
ں کی وجہ یہ ہے کہ میر و مومن دونوں عین عالم شباب میں تیر عشق کے گھائل ہوئے اور داغ بڑھاپے میں۔ چنانچہ داغ کی محبت
جوانوں کی تندی و تیزی یا حرارت و توانائی نہیں بلکہ بوڑھوں کی سی اعتدال پسندی اور مصلحت کوشی ہے۔ وہ منی بائی حجاب
و والہانہ محبت کے مدعی بھی ہیں اور خود کو لئے دیئے رہنے کی کوشش میں بھی رہتے ہیں گویا وہ محبت کے قابو میں نہیں بلکہ
ت ان کے قابو میں ہے۔ وہ دل بہلا دے یا بڑھاپے کو جوانی کا سہارا دینے کے لئے حجاب کے سلسلہ معاشقہ کو برقرار رکھنا

چاہتے تھے، لیکن آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کا حوصلہ اُن میں نہ تھا۔

بظاہر داغؔ کا یہ زخمِ محبت ناسور بن گیا تھا۔ اس لئے کہ داغ نے 'فریادِ داغ' لکھنے کے بعد بھی حجاب سے تعلقا قائم رکھے اور پورے بیس سال بعد ۱۹۰۲ء میں حجاب پھر داغ کے پاس حیدرآباد پہنچ گئیں لیکن اب معاشقے کی صورت وہ نہ تھی دونوں میاں بیوی بننے پر رضامند بھی ہو گئے تھے۔ داغ آخر دم تک پیمان وفا نبھانے کی کوشش بھی کرتے ر لیکن یہ سب وضعداری کی باتیں تھیں۔ جسے لگاؤ کہتے ہیں نہ وہ پہلے تھا اور نہ بیس سال بعد پیدا ہو سکا، جو باہمی جھگڑ رد وکد۔ شکر رنجی اور فاصلہ شروع میں تھا وہ آخر تک باقی رہا۔ گویا اس معاشقے میں لگاؤ کم اور لاگ زیادہ تھی اس دونوں ایک دوسرے سے برابر دھوکے کھاتے رہے۔ نہ داغ کبھی حجاب سے مطمئن رہے اور نہ حجاب داغ سے کبھی دل کھول کر ظاہر ہے ایسے موقعوں پر محبت نہیں ہوتی صرف محبت کا شوق ہوتا ہے اور شوق بھی وہ جو فرزانگی کا دامن ہاتھ سے نہیں جا دیتا۔ خود داغ کو اس کا پورا احساس تھا چنانچہ انھوں نے ۱۷ر جون ۱۹۰۲ء کے روزنامچہ میں خود لکھوایا کہ " مرزا صاحب اب عمر ایسی نہیں کہ وہ عاشقانہ غمزوں اور نخروں کے متحمل ہو سکیں۔ یہ سب جوانی دیوانی کے کرشمے ہوتے ہیں " سر عبدالق کا یہ خیال بہت درست ہے کہ " داغ اپنی حسن پرستی اور نغمہ دوستی کی وجہ سے اس کے گرویدہ ہو گئے"۔ ان دنوں داغ عمر پچاس سال سے زائد ہو چکی تھی۔ جنسی اعتبار سے یہ عمر عشق و عاشقی کی نہ تھی اور پھر اعصابی امراض میں مبتلا بھی تھے ان وجوہ سے ان کی عاشقی کسی جنسی یا نفسیاتی خواہش کی بنا پر نہ تھی بلکہ حسن و نغمہ اس کا محرک تھا[1] اس بیا سے صاف ظاہر ہے کہ داغ کو حجاب سے عشق نہیں تھا بلکہ بعض اوصاف کی بنا پر وہ ان کے پسند خاطر ہو گئی تھیں، فریادِ داغ کے مرتب کا بھی یہی خیال ہے۔ لکھتے ہیں " لوگ یہ نہ سمجھیں کہ داغ واقعی حجاب کے عشق میں مبتلا تھے اس کو بلانے کے لئے بے چین تھے یہ صرف دل لگی تھی ورنہ انھیں فقط خوش گذارنی مقصود تھی" حجاب کو یہ خط لکھوائے چ روز بھی نہ گذرے تھے کہ نوح قادری الٰہ آباد سے آئے اور آتے آتے ایک خوبصورت طوائف کی تصویر لائے جو داغ نذر کی۔ اسے دیکھتے ہی داغ بے چین ہو گئے" چنانچہ داغ نے ایک خط کے ذریعہ پیغام محبت بھجوایا۔ اس سے پہلے عی اس وقت جبکہ دل و دماغ پر حجاب بڑی حد تک چھائی ہوئی تھیں انھوں نے مشہور طوائف ملکہ جان اور اس کی بی گوہر جان پر ڈورے ڈالنے شروع کئے تھے مگر یہ عمر کامیابی کی نہ تھی۔ ناکام رہے۔

یوں سمجھ لیجئے کہ داغ کا معاشقہ بے وقت کی شہنائی تھی —— ہیرو اور ہیروئن دونوں میں سے کوئی بھی اس لائ نہ تھا کہ جو صحیح معنوں میں دادِ عاشقی دے سکتا۔ داغ نے تو خیر حجاب سے جو وعدۂ محبت کیا تھا حسب مقدور اسے نبھا رہے اور وضعداری میں فرق نہ آنے دیا لیکن محبوبہ کے کردار میں بھی کوئی کشش نہیں ہے۔ حجاب کلکتہ بازار کو نوٹو ایک ڈیرہ دار طوائف تھیں[2]۔ منی بائی عرف منجھلی کے نام سے مشہور تھیں۔ موسیقی میں کمال رکھتی تھیں اور علوم مرو سے واقف ہونے کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتی تھیں۔ چڑھتے سورج کی پوجا ان کا شیوہ تھا۔ آج اس پانس کل اُس کے ساتھ۔ جان چھڑکنے والوں کی کمی نہ تھی۔ بڑے بڑے راجہ نواب اور نوجوان طرحدار اس پر جان د تھے۔ اسے کونسی ایسی ضرورت تھی کہ وہ باون سالہ بوڑھے داغ پر اپنی متاع حیات نثار کر دیتی اور زندگی

[1] فریادِ داغ ص ۱۲   [2] تذکرۃ الخواتین مرتبہ عبدالباری آسی

ق ونشاط سے ہاتھ دھوتی۔ داغ سے اس نے کہنے کو کہہ دیا کہ ؎

ہم تو بھوکے ہیں آدمیت کے — آدمیت کے ساتھ الفت کے
ایسے دیسوں میں جی نہیں لگتا — داغ سا آدمی نہیں ملتا

لیکن عملی طور پر معاشقے میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ داغ سے چار دن بھی نہ نبھ سکی۔

چار دن میں یہ اتفاق کی بات — اُن سے ایسی ہوئی نفاق کی بات
پیش آئی جو امتحان میں تھی — وہ پڑی شکل جو گمان میں تھی

حجاب خود کو داغ کا دلدادہ وگرویدہ بھی ظاہر کرتی تھیں لیکن ان کی بے روح محبت کا یہ عالم تھا کہ داغ کے دل جلانے ی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں جب تک داغ نے خوشامد کو شعار نہیں بنایا اور حجاب پر دوسروں سے دباؤ نہیں یا، وہ خود کبھی داغ کے پاس نہیں آئیں۔ اور اگر آئیں بھی تو داغ کے قابو میں نہیں رہیں۔ ضد اور نخرہ ان کے مزاج میں تھا اور نے داغ کا لحاظ خیال کئے بغیر جو ان کے دل میں آئی کرتی رہیں۔ ضد کا یہ عالم تھا کہ ؎

منھ سے جس بات پہ نہیں نکلی — دل سے پھر عمر بھر نہیں نکلی

اور ناز وغرور کی یہ کیفیت تھی کہ داغ سے صاف کہہ دیتی تھیں۔

ہم جو آئے یہ دل ہمارا تھا — ورنہ کیا آپ کا اجارہ تھا

حجاب کا کردار دراصل ایک تجربہ کار اور عیار طوائف کا کردار ہے وہ ہوس ناکی وعیش کوشی کے سوا محبت کے کسی اور ے آشنا نہیں ہے وہ بظاہر ہر ایک پر جان نثار کرنے کو آمادہ ہے حقیقتاً اسے کسی سے لگاؤ نہیں ہے پیرانہ سالی میں بھی ان تراز وتکلف کی کیفیت تھی کہ داغ کے اصرار کے باوجود ان کے ساتھ تصویر کھچانے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئیں۔ اُدھر داغ سے بت ہو رہی ہے۔ پیمانِ محبت کی تجدید کی جا رہی ہے۔ اُدھر دوسروں سے ملنے جلنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ چنانچہ اس قے کے زمانے میں بھی حجاب کئی کے ساتھ پابند ہو کر رہیں ۔ اس کے بعد حتے نامی کسی شخص سے نکاح بھی کر لیا۔ لیکن جب یہ دیکھا آباد میں داغ کی حالت سنبھل گئی ہے وہ شاہ دکن کے اُستاد ہیں اور ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ روزانہ نذرانے ئف گذرتے ہیں تو آخری عمر میں وہ پھر داغ کی طرف مائل ہوئیں۔ ظاہر ہے اس میں فرزانگی کے سوا دیوانگی کا کوئی پہلو نہ تھا لئے یہ خیال کرنا کہ حجاب کو داغ سے محبت تھی، درست نہیں، داغ کو تو خیر وضعداری کا پاس تھا وہ تو اپنے بھرم بھی کو کسی طرح تے رہے۔ لیکن حجاب ڈیرہ دار طوائف تھیں اس وضع کی پابند کبھی رہ سکی۔ آئے دن تو تو میں میں ہوتی رہتی اور دوسروں کو صلح کے لئے مداخلت کرنی پڑتی۔ ظاہر ہے یہ معاشقہ نہ تھا ایک تفریحی مشغلہ تھا جو آخر آخر داغ کے لئے دردِ سر بن گیا۔

قبال نمبر

میں اقبال کی تعلیم وتربیت۔ اخلاق وکردار۔ شاعری کی ابتداء اور مختلف ادوارِ شاعری۔ اقبال کا فلسفہ وپیام، تعلیم اخلاق وتصوف۔ اس کا آہنگِ تغزل اور اس کی حیاتِ معاشقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قیمت:- تین روپے

نگارِ پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

آگرے کے میلے

میکش اکبرآبادی

بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کسی زمانے میں آگرے میں سات دن اور آٹھ میلے ہوتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے سستا زمانہ تھا۔ روپیہ کم مگر فراغت زیادہ تھی۔ کمانے سے زیادہ لوگ خرچ کرنے کے راستے نکالتے رہتے تھے کنبے، برادری، دوست احباب کو جمع کرنے اور کھانا کھلانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے۔ شادی، بیاہ، موت اور غمی کا تو ذکر ہی کیا، کچھ نہ ہوا تو بسلاد اور کتھا ہی کے نام سے سب کو جمع کر لیتے۔ بچہ ماں کے پیٹ میں آیا اور ریت رسمیں شروع ہو گئیں۔ آج ساد وڑہے کل ستوانسہ پرسوں نووانسہ اور سنوں کا پکوان ان رسموں میں بٹ جاتا۔ عقیقے، ختنے، بسم اللہ اور منڈن میں ہی اچھی خاصی مہمان داری ہو جاتی کہ کمینوں کو جوڑے، بیڑے، مراسنوں کو نیگ جوگ غرض جہاں نت نئے ہنگامے رہتے ہیں وہاں میلوں ٹھیلوں کا پوچھنا ہی کیا۔ ایک ایک میلے کا پورے سال انتظار رہتا، مہینوں پہلے شوقین تیاریاں کرتے۔ ان میلوں میں زیادہ تر میلے مذہبی تھے لیکن کوئی میلہ بھی ایسا نہ تھا جن میں ہندو مسلمان برابر شریک نہ ہوتے ہوں اگر کسی کو معلوم نہ ہو تو صرف دیکھ کر کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ یہ میلہ ہندوؤں کا ہے یا مسلمانوں کا۔ کتنے ہی میلے ایسے بھی تھے جن کا کسی مذہب سے تعلق نہ تھا جیسے پیراکی کا میلہ، نڑ کا میلہ، میاں نظیر کا میلہ وغیرہ۔

پیراکی کا میلہ

آگرے کی پیراکی مشہور رہی ہے۔ معلوم نہیں کب سے یہ میلہ چلا آرہا ہے۔ اس میلے سے پیراکی کا فن زندہ ہے اور اس فن کے مظاہرے کے لیے یہ میلہ ہوتا ہے۔ برسات ہوئی دریا چڑھا اور پیراکوں کے دل میں پیرنے کی امنگ لہریں لینے لگی۔ یہ میلہ بھادوں کی نوچندی کو ہوتا ہے۔ مگر ایک مہینے پہلے سے پیراکوں کے غول اپنے نشان جھنڈے لیے ہر جمعرات کو دریا جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر بھادوں کی نوچندی جمعرات سے پہلے جو منگل آتا ہے اس دن ایک میلہ ہوتا ہے اسے ہجا کا بیالہ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہجا پیراکی کے استاد کی لڑکی تھی اور قوم کی سانقن[1] تھی۔ نوچندی کے میلے میں ججا حقہ

---

[1] سانقی یہاں حقہ پلانے والوں کو کہتے تھے۔ جب زمانے میں حقے کا رواج عام تھا تو شارع عام اور خصوصاً چوراہوں پر کچھ لوگ کمر کسے گلے میں چمڑے کا تھیلا، تھیلے میں کوئلے تمباکو لیے اور ہاتھ میں حقہ اٹھائے کھڑے رہتے تھے۔ جاتے آتے لوگ دو چار دم لگاتے دو چار باتیں کرتے اور کوئی کوئی دو ایک پیسے ان کے ہاتھ پر رکھ کر چلے جاتے۔ ان میں بعض بوڑھی عورتیں بھی یہ کام کرتی تھیں انھیں سانقن کہتے تھے۔ بچپن میں ان لوگوں کو میں نے دیکھا ہے۔

لے کر تیرتی اور پیراکوں کو حقہ پلاتی تھی ۔ سبھا کا انتقال نوچندی جمعرات سے پہلے منگل کو ہوا۔ اس لیے پیراکوں نے اس کی یاد میں یہ میلہ قایم کیا۔ یہ میلہ نوچندی سے دو دن پہلے منگل کو ہوتا ہے۔ جس جگہ پہلے پہل پیراکوں نے سبھا کی فاتحہ دلائی تھی وہ مقام اب سبھا مائی کا پیالہ کہلاتا ہے۔ اب بھی پیراک وہاں فاتحہ کراتے ہیں۔[1]

اصل میلہ نوچندی جمعرات کو ہوتا ہے۔ پہلے سب پیراک سیتد کے باغ جاتے ہیں وہاں ایک مزار ہے جہاں چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ کوئی چادر اور کوئی پنکھا۔ سب لنگوٹ باندھے نہائے ہوئے جاتے ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان کوئی کپڑے پہن کر نہیں جاتا۔ عام اعتقاد یہ ہے کہ وہاں چڑھاوا چڑھانے کے بعد کوئی پیراک ڈوبتا نہیں ہے۔

دریا جانے سے پہلے پیراکوں کے غول اپنے اپنے نشان لیے اپنے استاد کا نام لے کر ۔ ۔ ۔ ۔ " استاد کے کھیڑے کا بھلا" کے نعرے لگاتے، ڈھول تاشے باجے کے ساتھ ہندو ڈنڈے بھی کھیلتے ہوئے خاص خاص بازاروں کا گشت کرتے ہوئے دریا جاتے ہیں۔ کسی کے ساتھ کاغذ کے شیر، بھینڈھے اور دوسرے جانور ہوتے ہیں۔ کوئی اپنا بیڑا سجاتے اس پر پورے ساز و سامان کے ساتھ گاتے ناچتے جاتے ہیں اور اسی طرح دریا میں اتر جاتے ہیں۔ تیرنے میں پتنگیں بھی اڑتی ہیں اور کبوتر بھی۔ ناچ رنگ بھی ہوتے ہیں اور دوسرے کھیل تماشے بھی۔

پیرنے کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ کوئی چت پیٹھ کے بل تیرتا ہے۔ کوئی پیٹ کے بل کھڑا ہو کر جسے کھڑی لگانا کہتے ہیں اس کی خوبی یہ ہے کہ سینے تک بدن پانی سے باہر رہتا ہے بہت سے پیراک جمنا کے پل سے پانی میں کودتے ہیں۔ بہت سے اعتماد الدولہ کی سب سے اونچی منزل سے۔ دریا کے کنارے جدھر جدھر سے پیراک گزرتے ہیں۔ ہزاروں تماشائیوں کا مجمع ہوتا ہے اسی طرح آرام باغ چینی کا روضہ اعتماد الدولہ تماشائیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں طوائفیں اپنے اپنے طائفے لے کر آرام باغ پہونچ جاتی تھیں۔ گانے بجانے ہوتے اور میلے کی رونق دونی ہو جاتی۔ اب تقریباً ہر نشان کے ساتھ زنانے تھرکتے جاتے ہیں۔ شیر چیتے بھی بننے ختم ہو گئے ہیں اور باجے تاشے بھی۔

آگرے میں پیراکی کے بڑے بڑے استاد گزرے ہیں۔ اب یہ فن بھی روبہ زوال ہے۔ میں نے ایک آخری استاد ہنو خاں کو دیکھا تھا۔ گداز بدن، لمبا قد، سر پہ پٹے، منہ پر ڈاڑھی، دو پلی ٹوپی، انگرکھا پہنے۔ اب بڈھے ہو گئے تھے۔ مگر جب کوئی بڑا آدمی آتا تو فتحپور سیکری کی باوڑی میں اپنے پٹھوں کو لے کر جاتے اور پیراکی کے کرتب دکھاتے ان کے لیے پانی اور زمین میں کوئی فرق نہ تھا۔ پالتی مارے بیٹھے ہیں کروٹ لے کر لیٹ گئے، چت ہو گئے، غرض بیسیوں حال دکھاتے اور واہ وا میں خوش ہو جاتے۔ بند پانی اور بہتے ہوئے پانی کی پیراکی میں فرق ہے مگر ان کے لیے بند اور بہتے ہوئے پانی میں بھی کچھ فرق نہ تھا۔ ایک پیراک نے مجھے بتایا کہ مجھے میرے استاد نے مشق کرائی تھی کہ گھر سے چلتے وقت میں سانس روکتا تھا اور دریا پر پہونچ کر سانس ٹوٹتی تھی۔ لیکن خشکی میں اتنی دیر سانس روکنے کی مشق کے باوجود دریا میں اتنی دیر سانس نہیں روکی جا سکتی۔ پہلے زمانے میں فن بھی مخصوص حلقوں ہی میں رکھے جاتے تھے لیکن آگرے کے ایک استاد جن کا نام 'بلا' تھا انھوں نے مہتروں کو بھی یہ فن سکھا دیا۔ مہتروں نے جب ان کی خوشامد کی تو وہ چاندنی رات میں انھیں دریا لے جاتے اور تیرنا سکھاتے۔ آخر میں انھوں نے مہتروں کو نشان بھی دے دیا تھا۔ مہتر بھی اپنا نشان لے کر تیرنے جاتے

[1] ماخوذ از روحِ نظیر۔ مخمور اکبرآبادی

ھیں۔

پروفیسر شہباز نے زندگانی بے نظیر کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ خواجہ امیر جو نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے عہد میں اپنے والد کے ساتھ آگرے گئے تھے۔ اس تیرائی (تیراکی) کی نسبت اپنی کتاب معدن الجواہر ——— میں یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمارا گھر[1] جمنا سے قریب تھا۔ جب ہم دریا کی سیر کو جاتے تو اکثر اوقات پیراکوں کو دیکھتے کہ وہ بے شمار صنعتیں اس فن میں دکھاتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص موتی مشر نام کا تھا جس کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ وہ اتنا ماہر تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں دس آمیوں کو پکڑا دیتا اور پھر انھیں تیرتا ہوا دریا کے اس پار سے جاتا اور پھر واپس لے آتا۔ ایک دوسرا شخص بھونا مشر تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں ڈال دیتے اور وہ اسی ہیئت میں غوطے لگاتا برسات کے دریا کو جو دونوں کناروں سے ٹکراتا تھا پار کر لیتا اور پھر واپس آجاتا"[2]

شہباز نے تیراکی کے میلے کے متعلق نظیر کی ایک فارسی نثر نقل کی ہے جس میں تیراکوں کے کمال کا ذکر کیا ہے کہ وہ سطحِ دریا کو چاندنی کا فرش اور موجوں کو سیتل پاٹی سمجھتے تھے۔

اب یہ کمالات خواب و خیال ہو گئے ہیں۔ جاننے والے اگر ہوں گے بھی تو روشناس خلق نہیں ہیں۔ البتہ فتح پور سیکری میں ایسے لوگ ضرور ہیں کہ آپ اگر پیسہ چھا کرسے میں پھینک دیں تو وہ غوطہ مار کر نکال لیتے ہیں۔

میاں نظیر کا میلہ

شہباز نے لکھا ہے:۔

"جب نظیر کا انتقال ہوا کئی ہزار آدمی ہندو مسلمان جمع تھے۔ چوں کہ ان کا مذہب اثنا عشری تھا، بڑی دھوم سے نماز جنازہ حسب مذہب اثنا عشری پڑھائی گئی مگر دو نمازیں ہوئیں جس قدر ان کے شاگرد اہلِ سنت تھے انھوں نے الگ اپنا گروہ کرکے نماز پڑھی اور اوپر کی چادر اُن کی پارچہ پارچہ کر کے اہلِ ہنود لے گئے۔ نہیں معلوم ہندو شاگردوں نے پارچے رکھے، جلائے، کیا کیے۔

شاگردوں نے ان کی قبر سنگین بنوائی۔ ہندو شاگردوں نے سوم کے دن مزار پر میلا کیا۔ ناچ، رنگ اور شعر خوانی ہوئی اور (شاہ) غلام رسول کی مسجد میں ان کے پھول ہوئے۔

میلہ سال کے سال اب بھی ہوتا ہے"[3]

"مرقع اکبر آباد کے مصنف مولوی سعید احمد مارہروی نے لکھا ہے:۔

---

[1] گھر سے مراد غالباً قیام گاہ ہے [2] فارسی سے ترجمہ [3] زندگانی بے نظیر ص ۱۴۸

"نظیر کے انتقال کے بعد برسوں تک ہولی دوالی دسہرہ عید بقرعید کے تہواروں پر ہندو مسلمان جمع ہو کر مشاعروں کے جلسے کیا کرتے تھے"

مگر یہ میلہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ۱۹۳۱ء سے شروع ہوا ہے اس زمانے میں آگرے میں آرتی اور نماز کے سلسلے میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ بات کچھ اور تھی بنا دی گئی کچھ اور، اس طرح شہر کی فضا مکدر ہو گئی۔ دس پانچ آدمیوں کے سر پھوٹ گئے، دس پانچ آدمی رستہ چلتے چوٹ کھا گئے۔ اس زمانے کی لڑائی میں سر ہی پھوٹتے تھے۔ گرے ہوئے آدمی پر کوئی ہاتھ نہیں چھوڑتا تھا نہ کوئی چاقو چھری کا نام جانتا تھا۔ اس وقت شہر کے صلح پسند ہندو مسلمانوں نے مل کر طے کیا کہ میاں نظیر کا میلہ پھر جاری کیا جائے تاکہ آپس میں میل ملاپ بڑھے اور غلط فہمیاں دور ہوں۔ اتفاق کی بات کہ بسنت قریب تھی اس لیے تجویز ہوا کہ میلہ بسنت کے دن ہو اور شہر سے ہندو مسلمانوں کا ایک جلوس بسنتی کپڑے پہن کر نظیر کے مزار پر چلے اور وہاں جلسہ ہو۔ کپڑے بسنتی تو کسی نے پہننے منظور نہ کئے۔ مگر رومال سب نے بسنتی گلے میں باندھ لئے۔ اس کے لیے ایک کمیٹی بزم نظیر کے نام سے قایم ہو گئی جس کے اراکین میں رائے صاحب پنڈت برج ناتھ گوسوامی، بابو متھرا پرشاد کلکٹر، ڈاکٹر گوربخش رام ٹنڈن، بابو درگا پرشاد مہرا، حمید صاحب تاج محلی، مفتی انتظام اللہ صدیقی، مخمور اکبرآبادی اور راقم الحروف اور کتنے ہی دوسرے اصحاب مقرر ہوئے۔ شروع میں یہ میلہ اس طرح ہوتا تھا کہ تجویز و تحریک صدارت کے بعد سکریٹری اپنی رپورٹ پڑھتا تھا۔ صدر صاحب اپنا خطبہ پڑھتے تھے پھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد میاں نظیر کے شاگردوں کے سلسلہ کے لوگ میاں نظیر کا کلام پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ اس جلسے میں جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم

کیا کیا ٹھسک دکھاتے ہے لونڈا فقیر کا

پڑھی تھی۔ لیکن کمیٹی نے یہ محسوس کیا کہ عوام و خاص سب ہی یہاں میاں نظیر کی نظمیں سننے آتے ہیں نہ کہ دوسرے شاعروں کو، اس لیے مشاعرہ موقوف کر دیا گیا۔ اب تقریر صدارت سکریٹری کی رپورٹ اور ایک آدھ مقالہ نظیر پر پڑھا جاتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ہزاروں آدمی یہ انتظار کرتے ہیں کہ نظیر کی نظمیں کب شروع ہوں۔ اس جلسے میں ہندو مسلم اہل علم یونیورسٹیوں کے فاضل، حکومت کے ارباب حل و عقد، شاعر سب ہی شریک ہوتے ہیں اور ان کے دوش بدوش ہزاروں عوام دلچسپی کے ساتھ گھنٹوں خاموش بیٹھے نظیر کی نظمیں سنتے رہتے ہیں۔ نظیر کی نظمیں جن لوگوں کو یاد ہیں وہ تقریباً سب ہی اَن پڑھ لکھے ہیں۔ لیکن یہ نظمیں انھوں نے اپنے استادوں سے یاد کی ہیں۔ یہ لوگ ایک خاص انداز سے یہ نظمیں پڑھتے ہیں اور اپنے کو میاں نظیر کے شاگردوں کے سلسلے سے وابستہ بتاتے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ پارسال خلیفہ محمد (محمد) کا انتقال ہو گیا وہ اس گروہ کے بہترین پڑھنے والے تھے۔ بزم نظیر کی کوشش سے نگرمہاپالکا میونسپل کارپوریشن، آگرہ نے اس سال یہ تجویز منظور کر لی ہے کہ میاں نظیر کی قبر پر ایک پارک بنوا دیا جائے۔

ہولی

ہولی، دیوالی، دسہرہ، رام لیلا اور عید بقرعید محرم ہندوستان میں کہاں نہیں ہوتے، پھر بھی ان کی تفصیل سے قطع نظر چند خصوصیات کا ذکر کرنا کافی ہوگا جس سے آگرے کی گزشتہ معاشرت کا اندازہ ہو سکے۔

ہولی سے چند روز پہلے بازاروں میں چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے عموماً دیہاتی مذاق کا نشانہ بنائے جاتے

تھے۔ کبھی کوئی مزدور آ پھنسا تو اس سے مٹکا اٹھوا کر لے چلے اور جب بیچ بازار میں آئے تو مٹکا توڑ دیا۔ اور مزدور رنگ میں شرابور ہو گیا۔ ہندو ہو یا مسلمان جو بھی مذاق کا نشانہ بنتا ہنستا ہوا چلا جاتا۔ عام طور پر سفید پوش اور شائستہ آدمیوں کا لحاظ رکھا جاتا۔ دھولینڈی کے دن تو گلال اور عبیر کا مینہ برس جاتا تھا۔ ہوا کے ساتھ گلال اڑ کے مکانوں کے اندر تک پہونچ جاتا۔ بازاروں میں رنگ کی کثرت کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ بہت سی ٹولیاں ڈھول یا ڈھپلی (دف) پر ہولی گاتی نکلتی تھیں۔ ایک ٹولی میں پچیس آدمیوں کی تاج گنج سے شہر آتی تھی۔ یہ بے نواؤں کا سوانگ بھرے، زرد کپڑے پہنے، گلے میں سیلیاں ڈالے، منھ پر بھبھوت ملے، سر پر جلنے کی صورت کی پگڑیاں باندھے، دف، ستار اور دوسرے سازوں پر ہولیاں گاتے آتے تھے۔ یہ سب مسلمان تھے اور اپنے کو میاں نظیر کا شاگرد کہتے تھے۔ ان پر کوئی رنگ نہیں ڈالتا تھا نہ یہ کسی پر رنگ ڈالتے تھے۔ ہولی کے دن شام سے ہی جلوس نکلنے شروع ہو جاتے ہر محلے کا جلوس علیحدہ علیحدہ دنوں میں نکلتا۔ یہ جلوس اب بھی نکلتے ہیں لیکن پھول ڈول کے علاوہ ہر بازار میں رات کو تخت ڈال دیئے جاتے تھے اور طوائفوں کا مجرا ہوتا تھا۔ اسے بھی پھول ڈول ہی کہتے تھے۔ آج اس محلے کا پھول ڈول ہے۔ کل اس محلے کا۔ اب برسوں سے بے نواؤں کا سوانگ نہیں آتا نہ طوائفوں کا مجرا ہوتا ہے۔ طوائفوں کی جگہ نوٹنکی والے لڑکوں اور خیال بازوں نے لے لی ہے۔

شب برات، ہولی اور عید کے بعد تاج گنج میں بڑا میلہ ہوتا تھا اور شہر کے عوام و خاص سب شریک ہوتے تھے۔ ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی اپنے ماموں سے سنا ہوا بیان کرتے ہیں کہ ایک وکیل صاحب جو آگرے کے کائستھ خاندان سے تھے۔ تاج کے ہر میلے میں پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ نوکر قالین گاؤ تکیہ اور حقہ لے کر پہونچ جاتا اور تاج کے درمیانی سنگ مرمر کے حوض کے شمال مشرقی کونے پر قالین تکیہ لگا دیتا۔ وکیل صاحب اس پر حقہ لے کر بیٹھ جاتے۔ دوست ملاقاتی جاتے آتے رہتے۔ جب میلہ ختم ہوتا تو مع سامان گھر لوٹ آتے یہ ان کا معمول تھا۔ ایک سال کچھ لوگوں کو شرارت سوجھی اور انھوں نے وکیل صاحب کا سامان پہونچنے سے پہلے اسی جگہ فرش کر کے ایک طوائف اور اس کے ساتھیوں کو بٹھا دیا۔ وکیل صاحب اپنے وقت پر آئے۔ دیکھا کہ ان کی جگہ خالی نہیں ہے۔ نوکر نے سامان ایک طرف رکھ دیا۔ خود دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے رکھے ٹہلتے رہے۔ یہاں تک کہ میلہ ختم ہو گیا اور طوائف اٹھ گئی تو نوکر کو حکم دیا کہ قالین تکیہ رکھو۔ اس نے وہیں قالین بچھایا۔ وکیل صاحب بیٹھے حقہ پیا اور تب وہاں سے واپس ہوئے۔

ہولی کے دن شام کو اب کئی شائستہ محفلیں بھی ہوتی ہیں ان میں شری دیوکی نندن وبھو سابق ممبر اسمبلی کی کوٹھی پر جو محفل ہوتی ہے وہ مخصوص ہے۔ شہر کے تمام قوم پرست ہندو مسلمان ان کے یہاں جمع ہوتے ہیں۔ پان، شربت، اور میووں سے سب کی تواضع ہوتی ہے۔ کچھ مزاحیہ کویتائیں، کچھ نظمیں اور تقریروں پر یہ جلسہ ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرے دن شام کو ہیوٹ پارک میں (جس کا نام اب پالیوال پارک ہو گیا ہے)، ایک بہت ہی شگفتہ میلا ہوتا ہے جس میں ہزاروں آدمی ہوتے ہیں۔ مگر سب پُرسکون۔ مختلف نیتاؤں کے کیمپ ہوتے ہیں جہاں بیاری لائچی سے تواضع ہوتی ہے۔ یہ میلا مہا پالیکا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس دن اور اس میلے کا سب سے دلچسپ منظر وہ تقریب ہوتی ہے جو ۱۹۶۲ء سے "ورِدھ جن سمان سمیتی" کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اس کے بانی اور صدر شری ہری کشن گپتا ہیں۔ یہ بیلن گنج کے پرانے رئیس اور سابق زمیندار ہیں۔ اس جماعت کا مقصد یہ ہے کہ بوڑھے

ہیوں کی عزت کی جائے اور سوسائٹی میں انھیں کم نگاہی کا شکار نہ ہونا پڑے۔ گپتا جی اس تحریک کو عالمگیر تحریک بنانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ۱۹۶۲ء میں انھوں نے جاپان کا سفر بھی کیا تھا اور ایک تاج محل کا موڈل اپنے ساتھ لے گئے تھے ٹوکیو کا معمر ترین انسان اٹھانوے سال کا تھا۔ آگرے میں ہر سال وہ معمر ترین آدمی کی تلاش کرتے ہیں اور ہولی کے دوسرے دن کے میلے میں ایک ٹینٹ لگتا ہے۔ اس میں اسٹیج پر اس آدمی کو بٹھایا جاتا ہے اور نہایت شوخ سرخ رنگ کے مخمل کا زردوزی سے کڑھا ہوا تاج اور ایک جبہ اسے پہنایا جاتا ہے اور اس کی عمر کے اعتبار سے فی سال ایک روپیہ کے حساب سے تھیلی اسے پیش کی جاتی ہے۔ جلسہ حسب دستور صدر کے انتخاب اور تقریر سے شروع ہوتا ہے۔ نظمیں ہوتی ہیں گانا اور قوالی ہوتی ہے اور پھر یہ جلسہ ختم ہو جاتا ہے۔ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء میں یہ انعام ایک رفیوجی شری بوٹا رام نے حاصل کیا۔ ان کی عمر ایک سو چھ سال تھی۔ ۱۹۶۲ء میں انھیں ایک سو چھ اور ۱۹۶۳ء میں ایک سو سات روپے پیش کئے گئے۔ اس سال شری بوٹا رام کا انتقال ہو چکا تھا۔ لہٰذا ۱۹۶۴ء کا انعام نل گنج کے رہنے والے شری کریم الدین اور مسماۃ بتتیا شورے کو دیا گیا۔ شیخ کریم الدین کو ان کی عمر کے حساب ایک سو چار روپیہ اور مسماۃ بتتیا کو ایک سو دو روپیہ پیش کئے گئے شریمتی بتتیا کو تاج کے ساتھ جائے پہلنے کے سرخ مخمل کی چادر اڑھائی گئی۔ شیخ کریم الدین اپنی صحت کے اعتبار سے چاق و چوبند نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی چشمے سے بے نیاز تھیں اور سب دانت بھی درست تھے۔ البتہ شریمتی بتتیا آنکھوں اور کانوں سے بالکل معذور تھیں۔ ان کے پوتے انھیں گود میں لے کر آئے تھے۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ کہیں اسٹیج پر ہی یہ دم نہ توڑ دیں۔

شری گپتا اس سلسلے میں اب تک صرف آگرے ہی میں ایک ہزار روپیہ کے قریب خرچ کر چکے ہیں۔ پوشاک ہی پر فی آدمی سو روپیہ سے زیادہ صرف ہو جاتے ہیں۔ خیمہ وغیرہ میونسپلٹی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس سال اس جلسے کی صدارت کاکا کالیلکر نے کی۔

کیلاش کا میلہ

ساون شوار نری کو کیلاش کا میلہ ہوتا ہے۔ کیلاش ایک مقام ہے جو سکندرے کے مغرب میں جمنا کے کنارے ہے۔ یہاں مہادیو جی کا مندر ہے۔ جہاں پوجا کرتے چڑھاوا چڑھاتے اور پرکرما کرتے ہیں۔ لیکن اصل میلہ سکندرے میں ہوتا ہے اس میلے کی خصوصیت یہ تھی کہ مسلمانوں کی تعداد کسی طرح ہندوؤں سے کم نہیں ہوتی تھی۔ اس زمانے میں کوئی میلہ بغیر طوائفوں کے میلہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ طوائفوں کے ڈیرے اور بستر سکندرے میں ہوتے تھے۔ اس لئے سارا میلہ سکندرے میں ہی پڑتا تھا۔ تماش بینوں اور شوقینوں کو پہلے سے فرمائشیں پوری کرنا پڑتی تھیں۔ کبھی رقابت میں اور کبھی فرمائش پوری نہ کرنے پر خون خرابے اور خودکشی تک نوبت پہونچ جاتی تھی۔

سیتلا کا میلہ

کیلاش کے علاوہ سیتلا کا میلہ بھی مشہور ہے۔ اس میں دیوی کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ میلہ پیر کے پیر ہوتا ہے۔ ساتوں پیر یعنی چوتھے پیر کو بڑا میلہ ہوتا ہے۔ یہ میلہ ایک دن عورتوں کا ہوتا ہے ایک دن مردوں کا۔ سیتلا کا مندر رتندھاری کے آگے ہے۔

خان کا میلہ

آگرے کے جنوب میں آگرہ کینٹ اسٹیشن سے میل ڈیڑھ میل چل کر کمال خاں کی قبر ہے۔ قبر اتنی مشہور نہیں ہے جتنا کمال خاں کا کنواں مشہور ہے۔ اتنا بڑا کنواں شاید کہیں اور ہو۔ اس کنوئیں کے پاس ہی کمال خاں کی قبر ہے۔ کہتے ہیں کہ اکبر نے ایک باغ لگوایا تھا جس میں نولاکھ درخت تھے اس لئے اس جگہ کو نولکھا کہتے ہیں۔ اس باغ کو پانی دینے کے لئے یہ کنواں بنوایا تھا۔ عوام میں کمال خاں کی کرامتیں بہت مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ ہاتھی کے عہادت تھے اور ہاتھی سمیت اس کنوئیں میں کود گئے تھے۔ سال کے سال اس کنوئیں پر میلہ لگتا ہے۔ گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے سے لاکھوں آدمی آتے ہیں۔ اٹاوے اور مین پوری تک کی خلقت یہاں جمع ہوتی ہے۔ یہ میلہ چار روز رہتا ہے۔ کھیل تماشے چرخ، ہنڈولے بازار سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ کنوئیں کے اندر ایک بڑا لوہے کا توا لگا ہوا ہے جو زنجیروں سے اوپر سے لٹکا دیا گیا ہے۔ مزار پر بکرے ذبح ہوتے ہیں۔ تیل اُرد چنے کی دال، دہی، بورا، آٹے کے بنے ہوئے چراغ چڑھتے ہیں۔ کچھ گوشت چڑھا دیا جاتا ہے۔ باقی لوگ کھانے کے کام میں لے آتے ہیں۔ بچوں کے منڈن ہوتے ہیں۔ پوجا ہوتی ہے گیت گائے جاتے ہیں۔ مجاور سوکھی چیزیں رکھ لیتے ہیں۔ تیل اور پیسے کنوئیں میں ڈال دیتے ہیں۔ میلے کے بعد توا زنجیروں کی مدد سے اوپر کھینچ لیتے ہیں اور پیسے نکال کر بانٹ لیتے ہیں۔ کمال خاں کے معتقدین میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ میلہ بھی ہندو مسلمانوں کا ملا جلا میلہ ہے۔

دیوچھٹ کا میلہ

یہ میلہ اس لیے عوام و خواص کی دل چسپی کا مرکز اور مشہور رہے کہ اس میلے میں عرصہ دراز سے اکّوں کی اور اِکّے (یکے) ختم ہونے کی وجہ سے اب تانگوں کی دوڑ ہوتی ہے۔ یہ دوڑ سکندرے سے شروع ہو کر فرح زیھرے تک ہوتی ہے۔ فرح ایک گاؤں ہے جو آگرہ متھرا کے درمیان واقع ہے۔ اس دوڑ کے لیے سال سال بھر گھوڑوں کو تیار کیا جاتا ہے۔ ایک ایک گھوڑے پر سینکڑوں کی بازی لگتی ہے اور گھنٹوں میں ہزاروں روپیہ کی ہار جیت ہوتی ہے۔

تلقلیں

دیوچھٹ سے زیادہ دل چسپ اور مشہور تلقلوں کا میلہ ہے۔ تلقلیں اڑائے جانے والے کبوتروں کو بھی کہتے ہیں اور کبوتر اڑانے کو بھی۔ پہلے یہ میدان سکندرے کے باہر ہوتا تھا۔ پھر تاج کے باہر ہونے لگا۔ معلوم ہوا ہے کہ اس سال پولیس نے بند کر دیا ہے۔ کیونکہ کبوتروں کے ساتھ آدمی بھی لڑ جاتے تھے۔ اب کبوتروں پر بھی ٹیکس لگ گیا ہے اس لیے شاید یہ ہمیشہ کے لیے ہی ختم ہو جائے۔

بانس کی کھپچیوں کا ایک بڑا سا ڈربہ سا بناتے ہیں۔ اس میں چار پہیے ہوتے ہیں۔ ایک ایک گاڑی میں سینکڑوں کبوتر بند ہوتے ہیں۔ یہ گاڑیاں لے کر مختلف ٹولیاں میدان میں جمع ہو جاتی ہیں اور اپنے اپنے کبوتر اڑاتی ہیں۔ ہزاروں کبوتروں سے آسمان چھپ جاتا ہے۔ کبوتروں کا ایک غول دوسرے غول میں جاتا ہے اور گھمسان کا رن پڑتا ہے ادھر کبوتر بازوں کی آوازوں اور زٹیلوں سے ایک محشر زمین پر بپا ہو جاتا ہے۔ پھر جب کبوتروں کی ٹولیاں حریفوں کو گھیرے ہوئے اپنی چھتری پر اترتی ہیں تو کبوتر بازوں میں قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ جس کے کبوتر دوسرے کبوتر باز نے پکڑ لیے اس کی ناک کٹ گئی۔ کسی نہ کسی طرح وہ اپنے کبوتر اس سے واپس لے گا، خوشامد سے پیسے سے اور جیسے بھی بنے۔ ایک

یک کبوتر دس سے لے کر سو سو روپے تک دے کر واپس لیا جاتا ہے۔ صرف آبرو ہی کا سوال نہیں ہے بلکہ نسل کا بھی سوال آپڑتا ہے ایسا نہ ہو کہ ہمارے کبوتروں کی نسل دوسرے کے یہاں چلی جائے۔ کبوتروں کو مختلف قسم کی غذائیں ور مقویات دے کر تیار کیا جاتا ہے۔ سینکڑوں نسخے سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار اور نواب س مرض میں مبتلا ہیں۔ آگرے میں کبوتر بازی کے بڑے بڑے استاد تھے۔ آخری استادوں میں نائی کی منڈی والے حکیم اسحاق تھے۔ شاعری میں سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ پہلوانی اور بانک بنوٹ میں دم بھرتے تھے۔ حکیم بھی ؤی تھے۔ سانپ پالنے کا بھی شوق تھا۔ غرض آگرے کے ایک مخصوص دور کے پورے نمائندے تھے۔

گن گوروں کا میلہ

گن گوروں کا میلہ راجستھان اور خصوصاً جے پور میں دھوم دھام سے ہوتا ہے مگر یو۔ پی میں شاید صرف آگرے ہی میں یہ میلہ ہوتا ہے اور آگرے میں بھی ایک مخصوص محلے موتی کٹرے کو یہ خصوصیت حاصل ہے ہر سواری میں دو مورتیاں ہوتی ہیں۔ ایک شیوجی کی اور ایک پاربتی جی، انھیں گنگور کہتے ہیں۔

یہ گنگوریں مختلف برادریوں کی ہوتی ہیں۔ ان کا جلوس آگے پیچھے ہوتا ہے۔ اگر والوں کی اوسوالوں کی، برہمنوں کی ٹھاکروں کی، مالیوں کی، اہیروں کی۔ ایک ایک گنگور ایک ایک لاکھ کا زیور پہنے ہوتی ہے۔ اس موقع پر ہر برادری اپنے زیوروں اور مالیت کی نمائش کرتی ہے اور ایک کا دوسرے سے مقابلہ ہوتا ہے۔ عام ہندوؤں کے جلوسوں کی طرح اس میں ڈنڈے نہیں کھیلے جاتے ہیں صرف اہیروں کے جلوس میں ڈنڈے کھیلے جاتے ہیں ویلے باجا گاجا پورا لوازمہ ہوتا ہے۔ یہ میلہ ہولی کے کچھ دن بعد ہوتا ہے۔ جب سے گولڈ کنٹرول ہوا ہے زیوروں کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ اب سونا کم اور جواہرات زیادہ ہوتے ہیں۔ گنگوروں کے گیت بھی مخصوص ہیں۔ راجستھانی گیتوں میں کچھ ترمیم کر لی گئی ہے۔

رام لیلا اور دسہرہ۔

میں نے بچپن میں گوالیار کے مہاراجہ کی دسہرے کی سواری دیکھی ہے جسے دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور صبح سے شام ہو گئی تھی۔ پھر جے پور میں ہولی اور دسہرے کی سواری دیکھی۔ جن لوگوں نے یہ جلوس نہیں دیکھے وہ اس کی شان و شوکت، زیب و زینت، غلغلے اور ہمہمے کا تصور بھی نہ کر سکیں گے۔ جے پور کے جلوس میں کئی چیزیں ایسی دیکھیں جن کا نام ہی سنا تھا، مثلاً ماہی مراتب، لین ڈوری، سانڈنی سوار وغیرہ۔ اس ریاست نے مغلوں کے دیئے ہوئے اعزاز اور روایات کو آخر دم تک بڑی احتیاط کے ساتھ قایم رکھا۔ اب ریاست کے ساتھ وہ روایات بھی زیب داستان ہو گئیں۔

آگرے میں دسہرے کے دن خاص شہر میں کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ رام لیلا کے میدان میں لاکھوں آدمی راون کو جلتا ہوا دیکھ کر رام چندرجی کی جے بولتے ہیں اور اس طرح ذات پات کے بندھنوں سے بلند ہو کر حق اور انصاف کی فتح پر خوشی مناتے ہیں لیکن رام لیلا کی برات کا جلوس اور اس سے پہلے اور بعد کے تمام جلوس جیسے گنیش جی کی سواری، بن باس، دھنش یگ سینا ہرن اور راون کی دہائی، بھرت ملاپ سب شہر میں نکلتے ہیں۔ رام چندرجی کی برات کے دن بازاروں میں سب سے زیادہ ہجوم ہوتا ہے۔ مٹی کے کھلونے بیچنے والے جس طرح رنگ برنگ کے کھلونے اوپر نیچے قطار در قطار چن دیتے ہیں۔

بالکل اسی طرح رنگ برنگ کے لباس پہنے عورتیں اور بچے مکانوں کی چھتوں، چھجوں، برآمدوں، گوکوں، اور دوکانوں پر لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ جدھر جدھر سے یہ برات گزرتی ہے ہجوم ادھر ادھر ہی منتقل ہوتا رہتا ہے کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بوجھ سے کوئی چھجہ ٹوٹ پڑا ہے اور کئی جانیں ضایع ہو گئی ہیں۔ برات کا جلوس منکا میشور کے مندر سے شروع ہوتا ہے اور شہر کے خاص خاص بازاروں کا گشت کر کے پھر وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ گشت تقریباً ۱۲ گھنٹے کا ہوتا ہے۔ یعنی شام کے چار بجے سے صبح کے تین چار بجے تک منکا میشور کا مندر آگرے کا قدیم ترین اور مقدس ترین مندر سمجھا جاتا ہے۔ برات میں تاشے، باجے سب ہی کچھ ہوتے ہیں۔ لیکن اس جلوس میں آگرے کے تجارتی حلقوں کی پوری نمایندگی ہوتی ہے۔ ایک ایک ٹھیل ایک چلتی پھرتی دوکان ہوتی ہے اور زینت کے علاوہ اس طرح دوکان کا اشتہار بھی خوب ہو جاتا ہے۔ بیل گاڑیوں میں گانے والوں کی ٹولیاں ہوتی ہیں جو تھالی منکا بجاتے گا جاتے ہیں۔ کوئی ان میں سانپ گلے میں ڈالے ہوتے ہیں کوئی چھریاں اور تیکلے گردن پیٹ اور زبان کے آر پار چبھوتے اور کوئی منہ سے شعلے نکالتے چلے جاتے ہیں۔ دسرتھ جی وششٹ جی اور دوسرے رشیوں کی سواریاں ہوتی ہیں اور آخر میں بینڈ کے ساتھ آٹھ دس ہاتھیوں کا جلوس ہوتا ہے جس میں رام چندر جی کے بھائی اور آخر میں رام چندر جی دولھا بنے ہاتھی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ رام لیلا کا بھی ایک فنڈ ہے جس میں کاروباری اور لین دین کرنے والے سب حصہ لیتے ہیں یہاں تک کہ قرض لینے والوں کو مہاجن جو روپیہ دیتے ہیں اس میں سے پہلے رام لیلا کے لیے روپیہ مجرا کر لیتے ہیں۔ اس برات کا ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد آتا ہے۔ بہت دن کی بات ہے۔ ریاض خیرآبادی کے چھوٹے بھائی سید نیاز احمد آگرے میں کوتوال تھے۔ کسی زمانے میں ان کے والد سید طفیل احمد صاحب بھی آگرے میں کسی عہدے پر تھے اور ریاض خیرآبادی اور سید نیاز احمد صاحب میرے والد محترم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس تعلق سے سید نیاز احمد صاحب ہمارے یہاں آتے جاتے تھے۔ ایک دن جب رام لیلا کی برات نکل رہی تھی اور ہم لوگ گوک میں بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ کوتوال صاحب وردی پہنے ہوئے کانسٹیبلوں کو ساتھ لیے ہمارے یہاں گھبراتے ہوئے آئے۔ کرسیاں کہاں ہیں؟ انھوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ہمارے یہاں اپنے زمانے کی چار پانچ کرسیاں پڑی ہوتی تھیں۔ دوسرے کمرے میں وہ خود اور کانسٹیبل کرسیاں اٹھا کر لائے اور گوک میں ڈال دیں۔ اتنے میں تین چار انگریز آ گئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نرگسن کلکٹر تھے۔ ان کے ساتھ جنٹ مجسٹریٹ، اور سپرنٹنڈنٹ پولیس وغیرہ تھے۔ اس زمانے میں ان عہدوں پر عموماً انگریز ہی ہوتے تھے۔ ہم گوک خالی کر کے باہر آ گئے۔ مسٹر نرگسن نے ہم سے معذرت کی اور پوچھا اب آپ لوگ کہاں سے دیکھیں گے۔ میں نے کہا سب سے اوپر کی منزل سے دیکھ لیں گے، ہمیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اس زمانے میں میری گیارہ بارہ سال کی عمر تھی۔ کوئی اور مرد ہمارا سرپرست نہ تھا۔ جو تواضع کرتا۔ یہ فرض بھی کوتوال صاحب ہی کو انجام دینا پڑا۔ اتنے میں ایک کھٹیک نے اپنی بیل گاڑی میں سے ایک سیب پھینکا وہ جنٹ صاحب کے گال پر پڑا۔ وہ غصے کے مارے کھڑے ہو گئے۔ کلکٹر صاحب کو ناگوار گزرا مگر کوتوال نے سمجھایا کہ یہ لوگ تواضع اور تعظیم کے اظہار کے لیے ایسا کرتے ہیں تب وہ پھر بیٹھ گئے۔

کرشن لیلا

رام لیلا کی طرح کرشن لیلا بھی ہوتی ہے۔ یہ رام لیلا کے بعد ہوتی ہے۔ جعفر خاں کے روضے میں

ایک گئو شالہ ہے۔ وہاں سے اس کا جلوس نکلتا ہے۔ ہر میلے پر ایک جھانکی ہوتی ہے جن میں شری کرشن کی زندگی کے مختلف مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ رام لیلا کی طرح اس کا فنڈ بھی جمع ہوتا رہتا ہے۔ اب بھی سنا ہے ڈھائی تین لاکھ روپیہ اس مد میں جمع ہے۔ رام لیلا کے منتظم شری گوکل اور کرشن لیلا کے منتظم شری کالی چرن ہیں جو گئو شالہ کے سکریٹری بھی ہیں۔ ویسے جنم اشٹمی پر بڑی دھوم دھام رہتی ہے۔ جگہ جگہ ہنڈولے سجائے جاتے ہیں اور محرم کی سبیلوں کی طرح ان میں مختلف قسم کے مناظر بنائے جاتے ہیں اور سجاوٹ کی جاتی ہے۔ آگرے میں بوہرے رام گوپال کا دریبیٹر کا ہنڈولہ مشہور ہے۔ جنم اشٹمی پر جاٹو برادری کا جلوس بھی بڑے دھوم دھام سے نکلتا ہے۔

ان میلوں کے علاوہ اور بھی کئی میلے ہوتے ہیں جن میں بالکیشر کا میلہ بھی مشہور ہے۔ اور جب سے پنجابی آگئے ہیں تو جمنا کے کنارے صبح کے وقت بیساکھی کا میلہ بھی ہونے لگا ہے۔

آگرے کے محرم

ہماری طرف آگرہ، جے پور، اودے پور اور گوالیار کے محرم مشہور تھے۔ گوالیار کے مہاراجہ مادھو سنگھ تو خود تعزیہ داری کرتے، فقیری پہنتے، مجلسیں کراتے اور دسویں کو ننگے پاؤں ننگے سر تعزیے کے ساتھ جاتے۔ وہاں کے محرم کا کہنا ہی کیا۔ مگر آگرے والوں کو آگرے کے محرم سے زیادہ کہیں کے محرم نہ بھاتے۔ مشہور بات تھی کہ آگرے کے آدمی کہیں ہوں محرم پر آگرے آجاتے ہیں۔

محرم کے دنوں میں آگرہ بالکل بدل جاتا ہے۔ بازاروں اور گلی کوچوں میں تعزیوں، سبیلوں کی آرائش و زیبائش اور چہل پہل کا یہ عالم ہوتا کہ دیکھے ہوئے گلی کوچے پہچانے نہ پڑتے۔ مسلمان تو مسلمان بہت سے ہندو تعزیہ داری کرتے فقیری پہنتے اور فاتحہ درود کرتے تھے۔ ہندو عورتیں اپنے بچوں کو لے کر تعزیوں کے نیچے سے نکلتیں، چڑھاوا چڑھاتیں، عرضیاں باندھتیں اور ہاتھ جوڑے کھڑی رہتیں۔ قدم قدم پر سبیلیں لگی ہیں کھلے کھلے بازار بازار تعزیے رکھے ہیں۔ سینکڑوں آدمی سبز کپڑے پہنے ادھر سے ادھر گھومتے رہتے۔ سال بھر جو لوگ کسرت نہ کرتے وہ بھی محرم سے ایک مہینہ پہلے کسرت شروع کر دیتے۔ اور پھر اپنے ڈنڈ پیلے خود دیکھتے اور دوسروں کو دکھاتے۔ بانکے بنے سارے شہر کا گشت لگاتے پھرتے اور پھر جب محرم ختم ہو جاتے تو سارے شہر پہ ایک سناٹا چھا جاتا۔ دل بجھ جاتے اور آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ ہندو دوکاندار ایک سے ایک پوچھتے رہتے محرم میں کتنے دن ہیں۔ قلفی بکری ان کی ان دنوں میں ہوتی سال بھر میں نہ ہوتی۔ فقیروں کے گروہ کے گروہ اور غول کے غول حسینؑ کی خیرات لیتے ادھر سے ادھر گھومتے پھرتے۔ سارا شہر یا حسینؑ یا حسینؑ اور نعرۂ حیدری یا حسینؑ اور ڈھول تاشوں کی آوازوں اور مرثیوں کی صداؤں سے گونجتا رہتا۔ پندرہ بیس دن چاند رات سے پہلے ایک فقیر سر پہ سبز کسا دہ کسے، سبز کرتا پہنے ایک ہاتھ میں علم ایک میں مورچھل لئے گشت شروع کر دیتا اسکے ساتھ ایک تاشہ اور ایک ڈھول ہوتا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر ڈھول تاشہ بند ہو جاتا اور وہ صدا لگاتا "ماموں بھانجے کی گھاٹی پر ہندو مسلمان کی کمائی سے تعزیہ بنے گا" اور ہندو مسلمان سب اسے پیسے دیتے۔ عورتیں بچوں کے ہاتھ سے پیسے دلواتیں اور وہ بچے کے سر پر مورچھل پھیر کر آگے بڑھ جاتا۔ سب جان لیتے محرم آگئے۔

چاند اگر انیس کا ہو گیا تو مغرب کے بعد نہیں تو تیس تاریخ کو مغرب سے پہلے گھٹا کے علم اٹھتے تھے۔ محرم کا چاند

صرف تعزیہ داری دیکھنے کو کھوے پر کھوا چھتے تھے اور کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ گھگا آگرہ گائیکی گھرانے کے نامی گویّے تھے اور نئی لستی میں میراثیوں کی گلی میں رہتے تھے وہیں ان کے علم رکھے جاتے تھے۔ ان کے علموں کا جلوس نئی لستی سے کشمیری بازار کناری بازار سیو کے بازار ہوتا ہوا چھپار ٹولے کے راستے سے پھر نئی لستی پہونچ جاتا تھا۔ جلوس میں شیعہ سُنّی کے عوام و خاص سب ہی ہوتے تھے۔ آگے تاشے ہوتے اس کے پیچھے مجمع ہوتا۔ علم ٹھہر جاتے تو تاشے بند ہو جاتے اور سوز خوانی شروع ہو جاتی۔ آگرہ گھرانے کے نامی فن کار سب ہی سوز خوانی کرتے۔ آفتاب موسیقی فیاض حسین خان استاد تصدق حسین خان استاد ولایت حسین خاں، استاد اسد علی خاں اور ان کا سارا خاندان ہی سوز خوانی کرتا جاتا۔ علم ان کے گھر کے ہی تو تھے۔ یہ علم اب گشت کو نہیں اٹھتے مگر اپنے مقام پر بدستور رکھے جاتے ہیں اور مجلسیں ہوتی ہیں۔ آفتاب موسیقی کے زمانے میں بڑے بڑے نامی گرامی لوگ انھیں سننے کے لیے اس مجلس میں آتے تھے۔ پہلی دوسری تاریخ میں بہت سے تعزیے، براقیں اٹھتی تھیں۔ کسی زمانے میں تیسری تاریخ بالکل خالی تھی۔ پھر کلّو نامی کمبوٹولے کے ایک شخص نے تیسری کو بھی ایک تعزیہ نکالنا شروع کر دیا۔ یہ تعزیہ مسالے کا کہلاتا تھا۔ تمام قسم کے اناج اور مسالوں سے اس میں پھول بیل بنائے جاتے تھے۔ چوتھی تاریخ کو کمبل کڑے کا بالوں کا تعزیہ اور بالوں کی براق اٹھتی تھی اور بہت سے تعزیے اٹھتے تھے مگر یہ تعزیہ اس لیے مشہور تھا کہ اس پر شروع سے آخر تک سبز گھاس بوئی جاتی تھی اور چوتھی تاریخ تک وہ گھاس چار چھ انگل بڑھ کر لہلہانے لگتی تھی۔ اسی طرح براق بھی تھی اور پھر بعد میں ایک سبیل بھی ایسی ہی گھاس کی اٹھنے لگی تھی۔ سبیل ایک تو اسے کہتے ہیں جو کسی مقام پر تخت بچھا کر آرائش کرتے ہیں اور پانی یا شربت وہاں پلایا جاتا ہے۔ اور ایک سبیل تعزیے کی قسم ہے۔ ان سبیلوں میں بڑی صنعت دکھائی جاتی تھی۔ ابرک اور پنی سے جو کوٹوں میں مختلف مقامات کے خوب صورت نقشے بنے ہوتے جو ڈوری کھینچنے سے ایک کے اندر سے ایک نکل کر بلند ہو جاتے تھے اور پھر انھیں نیچا کر دیا جاتا تھا۔ تعزیہ داری میں تعزیے کے علاوہ علم، شدّے، براق، سبیل، ذوالفقار، تابوت اور ضریح رکھے جاتے تھے۔ ضریح شیعوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ سُنّیوں میں کم اور شیعوں میں مجلس کا رواج زیادہ تھا۔ شاہ گنج کی مجلسوں کے علاوہ شہر میں شیخ بزرگ عالی کے یہاں پانچویں کی مسجد اور گلاب خانے کے امام باڑے کی آٹھویں کی مجلس بہت مشہور تھی۔ ان مجلسوں میں ہندو مسلم شیعہ سُنّی عمائدین شہر اور اہلِ علم سب ہی شریک ہوتے تھے۔ آٹھویں کی مجلس میں شیرمال تقسیم ہوتی تھی۔ امام باڑے کی وسیع عمارت میں کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی اور جو لوگ دیر سے آتے انھیں اندر جانا مشکل ہو جاتا۔ گھنٹہ گھنٹہ بھر مجلس ختم ہونے کے بعد بھی باہر آنا مشکل تھا۔ پانچویں کو پیک منائے جاتے تھے۔ ایک خاص قسم کی مڑوری دی ہوئی سفید اور نیلی شیواجی قسم کی پگڑی سر پر، رو پہلی بادلے کی بدھی گلے میں، کمر میں گھنٹیاں بندھی ہوئی ہیں بیس چالیس چالیس کے غول ادھر سے ادھر بھاگتے پھرتے، جدھر سے گزر جاتے۔ کیسا ہی مجمع ہو کائی کی طرح پھٹ جاتا۔ نو تاریخ کو یہ ساری رات تعزیوں پر شہیدی پڑھتے پھرتے۔ ایک آدمی مصرع پڑھتا

"آیا ہوں کربلا سے خبر لے حسین کی"

اور سب کہتے "ہے ہے" اس طرح پوری نظم ایک خاص لہجے میں پڑھی جاتی۔

ہر تعزیے کے دو گشت ہوتے تھے۔ ایک جب روزہ رکھا جاتا اور ایک نو تاریخ کو۔ ان تعزیوں کی وجہ سے تعزیہ داروں کا نام زندہ تھا۔ ورنہ بتایئے شہدی بنّو کا نام کون جانتا۔ مگر وہ تو مثال (مشعل) لیے اپنے تعزیے کے ساتھ ہوتی تھیں اور کسی نہ کسی سے جھگڑا کر ڈالتیں۔ اس وجہ سے لوگ انھیں شہدی بنّو کہتے تھے۔ اسی طرح بی پیاری کا تعزیہ، کالے چودھری کا

تعزیہ، حکیم شفیع اللہ اور صفدر خاں کے تعزیے تھے جو الا کے علم عبدا کی براق اور اس طرح کے بہت سے تعزیے تھے۔ جو رکھنے والوں کے نام سے مشہور تھے۔ بہت سے محلوں کے نام سے مشہور تھے ان کی وجہ سے ایسے اپنے محلوں کے نام سننے میں آجاتے تھے جنھیں عام طور سے لوگ نہیں جانتے۔ اور بہت سے تعزیے اپنی صنعت کاری کی وجہ سے مشہور تھے یہ واقعہ ہے کہ آگرے والوں نے اپنے فن اور صنعت کا کمال ان تعزیوں میں صرف کر دیا تھا۔ ایسا حسین اور باریک کام اب شاید دیکھنے میں نہ آئے۔ عبدا کی براق پر سنا ہے کہ چھ مہینے پہلے سے کام شروع ہو جاتا تھا۔ کوئی چیز شاید ہی ایسی باقی رہی ہو، جس کا تعزیہ بن سکتا ہو اور لوگوں نے نہ بنایا ہو، مثلاً روئی کا تعزیہ، ابرک کا تعزیہ، چوڑی کا تعزیہ، کاٹ کا تعزیہ، سرکی کا تعزیہ، موم کا تعزیہ، رانگ کا تعزیہ، کاغذ کے پھولوں کا تعزیہ، سچے پھولوں کا تعزیہ، مٹی کا تعزیہ، گھاس کا تعزیہ، ناج کا تعزیہ، مٹھائی کا تعزیہ، قالین کا تعزیہ، کپڑے کا تعزیہ یہاں تک کہ سونے چاندی کا تعزیہ بھی تھا۔ یہ تعزیہ گشت نہیں کرتا تھا۔ ہر تعزیہ میں صنعت کار اپنی صنعت اور فن کی ہر ممکن نمائش کرتا تھا۔ پھر گشت کے وقت گلی محلہ اسکے ان کی نمائش ہوتی۔ تعزیوں کا تعزیوں سے اور براقوں کا براقوں سے مقابلہ ہوتا۔ اس طرح تاشے والے تاشے والوں سے مقابلہ کرتے۔ ان کا مقابلہ یہ تھا کہ دونوں گروہ آمنے سامنے ڈٹ جاتے۔ باری باری تاشے نوازی کا کمال دکھاتے اس طرح گھنٹے گزر جاتے جو ہٹ جاتے وہی ہار جاتے۔ اس لیے لوگ درمیان میں پڑ کر صلح کرا دیتے اور دونوں چوکیاں ایک ساتھ تاشے کی ایک مخصوص گت تال بجاتی ہوئی اپنا اپنا راستہ لیتیں۔

آگرے میں چار تعزیے اپنی بلندی کے اعتبار سے مشہور تھے۔ مٹھائی کا تعزیہ، قلعہ کا تعزیہ، بالوگنج کا تعزیہ اور صاحب علی خاں کا تعزیہ۔ مٹھائی کا تعزیہ نوری دروازے میں رکھا جاتا تھا۔ یہ مٹھائی والے اور بتاشے والے رکھتے تھے قلعے کا تعزیہ قلعے میں رکھا جاتا تھا۔ یہ قلعے کے سپاہی رکھتے تھے۔ یہ چاروں تعزیے بہت بلند اور مینار کی شکل کے ہوتے تھے۔ ایک ایک تعزیے میں کتنے ہی کھن ہوتے تھے جو علیحدہ علیحدہ بنائے جاتے اور پھر اوپر نیچے رکھ کر کس دیے جاتے تھے۔ کھنوں میں چاروں طرف رسیاں باندھ دی جاتی تھیں جنھیں لوگ چاروں طرف سے کھینچے رہتے تھے تاکہ چلنے میں توازن قایم رہے اور تعزیہ کسی طرف جھک نہ جائے۔ قلعے کے تعزیے کی برجی پر کاغذ کے مور ناچتے رہتے تھے اور بالوگنج کے تعزیے پر کاغذ کی پھرکنیاں۔ مٹھائی کے تعزیے کی دو برجیاں ہوتیں جن کے کلس شکر سے بنائے جاتے تھے سارے تعزیے پر بتاسوں سے پھول بیل بنائے جاتے۔ سہرے میں بتاسے اور دوسری مٹھائیاں ہوتی تھیں۔ شہر میں اونچی سے اونچی عمارت سے یہ تعزیے اونچے ہوتے اور بازار کے قریب رہنے والوں کو اپنے صحن میں نظر آجاتے تھے۔ مٹھائی کا تعزیہ بلا استاد رکھتے تھے۔ مذہب سے ہندو اور پیشہ کے اعتبار سے بتاسے والے تھے۔ یہ بیراگی کے بھی استاد تھے۔ تعزیے کی محبت اور اعتقاد سے آخر عمر میں مسلمان ہو گئے تھے۔ وصیت کے مطابق کربلا میں جہاں ان کا تعزیہ دفن کیا جاتا تھا، اسی کے برابر دفن ہوئے۔ ان کا تعزیہ آٹھویں کی رات کو اٹھتا تھا اور لے جا کر راوت پاڑے میں سڑک پر رکھ دیا جاتا تھا پھر صبح سات بجے سے اٹھا کر دوسرے تعزیوں کے ساتھ گشت میں شریک ہو جاتا۔ ایک سال تعزیہ سڑک پر رکھا تھا کہ مہتروں نے جھاڑو دینا شروع کر دی اور تعزیے پر خاک پڑنے لگی۔ راوت پاڑہ ہمیشہ سے خالص اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور تجارت پیشہ لوگوں کا محلہ ہے۔ ان لوگوں نے بھنگیوں کو روکا۔ بھنگی نہ مانے اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ آخر خود بلا استاد نے صلح کرا کے معاملہ رفع دفع کیا۔ آگرے میں کالے محل کے قریب چوراہے پر گجرا والوں کی حویلی ہے۔ یہ وہاں کے سب بکانوں

ے بلند ہے اور مٹھائی کا تعزیہ اس سے بھی بلند ہوتا تھا ایک مرتبہ کسی نے حویلی کی بالائی منزل پر کھنگر رکھوا کر سے اور اونچا کر دیا۔ مٹھائی کے تعزیے والوں کو خبر ہو گئی۔ انھوں نے راتوں رات ایک کھن بنا کر اور لگا دیا اور جب تعزیہ حویلی کے مقابل پہونچا تو تعزیہ اونچا رہا۔

سات تاریخ کو آگرے کا مقبول ترین تعزیہ رکھا جاتا ہے۔ یہ سچے گلاب کے پھولوں سے بنتا ہے اور دیگوں کے کڑے میں رکھا جاتا ہے اور تعزیوں کی طرح اس کا بھی گشت موقوف ہے۔ اس میں کئی من پھول صرف ہوتے ہیں۔ اور گلاب، جو اس پر عقیدت سے لوگ چھڑکتے ہیں اس کا تو کوئی حساب نہیں جب یہ گشت کرتا تھا تو جن جن راستوں سے گزرتا تھا۔ بلا مبالغہ گلاب کی کیچڑ ہو جاتی تھی۔ سات تاریخ کو جب یہ تعزیہ بازار میں آتا تو بازار دوسرے تعزیوں سے بھرا ہوتا تھا۔ مگر احتراماً تمام ڈھول تاشے بند ہو جاتے تھے۔ یہ تعزیہ مرثیوں سے گشت کرتا تھا۔ یہ تعزیہ اب بھی رکھا جاتا ہے۔ اور ہر مذہب اور ہر فرقے کے زائرین اس کی زیارت کرتے ہیں۔

تعزیوں کے علاوہ محرم میں بڑی تعداد اکھاڑوں کی تھی جن میں فنونِ سپہ گری کی نمائش ہوتی تھی۔ ان میں ایک مشہو اکھاڑہ نتے استاد منیر خلیفہ کا تھا۔ یہ دونوں بھائی تھے۔ ان کے باپ بھکن خاں کہیں باہر سے وارد ہوئے تھے۔ انھیں ایک بنت گتکا داؤں ایسا رواں تھا کہ اچھے اچھے استادوں کے گتکے پٹے رکھوا لیے تھے۔ دونوں بھائی اکنگ، گتکا، ظف بیکر، بانا، بنیٹی، بچھوا، پٹہ سب ہی کچھ جانتے تھے اور بقول خود بانک بنوٹ کے بھی ماہر تھے۔ محرم کی آٹھ تاریخ کو ان کا اکھاڑ کناری بازار میں چوراہے سے ہٹ کر لگتا تھا۔ بلی کا ایک کنارا بازار کی ایک طرف کی کوک پر رکھ دیتے۔ ان میں رسّوں کے جھو بڑے کئی کئی جھولے پڑے ہوتے۔ سب پر لال ٹول لپٹی ہوتی۔ بیچ بازار میں تخت بچھ جاتے۔ جوانوں اور لڑکوں کی ٹولیا کسرتی ہم رنگ لباس پہنے ہوئے ان جھولوں پہ اور تختوں پر طرح طرح کی کسرتیں قلابازیاں اور جمناسٹک کے کرتب دکھاتے اسی کے ساتھ لکڑی پٹے کے کمالات کی نمائش کرتے نیز خلیفہ شاگردوں کے ماتھے پہ کوڑی رکھ کر تلوار سے کاٹ دیتے اور پیٹ پر پان رکھ کر ایسا پٹا لگاتے کہ پان کے برابر سے دو ٹکڑے ہو جاتے۔ کیا مجال جو ماتھے یا پیٹ پر ذرا بھی آنچ آ جائے ساتویں کو بلوچپورے سے شدے اور تاج گنج سے ذوالفقار اور شدے آتے تھے۔ تاج گنج کی چھٹی کی مہندیاں مشہور تھیں۔ نویں کے دن شام تک سا باجے تاشے سے گشت کرنے والے تعزیے گشت ختم کر دیتے اور دسویں شب میں جتنے تعزیے کہ مرثیے سے اٹھتے تھے وہ گشت کرتے۔ صبح ہر تعزیے پر شہیدی پڑھی جاتی۔ پھولوں کے تعزیے کی شہیدی بڑی مشہور اور پُر اثر تھی جسے سُننے کے لیے دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ پھر دس تاریخ کو تمام تعزیے کربلا لے جائے جاتے اور دفن کر دیئے جاتے۔ سب سے آخر میں جو الا کے علم آتے اسے دیکھ ہی لوگ سمجھ لیتے کہ اب شہر میں کوئی تعزیہ کربلا جانے کو باقی نہیں رہا۔ یہ علم بھی ایک ہندو کے تھے۔ محرم کے ڈھول تاشے باجے سب ایک ہی مخصوص لے تال سے بجائے جاتے اسے ماتم کہتے تھے سن کر معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ محرم کا ماتمی باجا ہے۔ ۱۹۴۶ء سے آگرے محرم ختم ہو گئے اور باجے تاشے والے بھی اپنا فن بھول گئے۔ اپنے اپنے مقام پر تعزیے اب بھی رکھے جاتے ہیں مگر مشکل سے سو دس۔ فاتحہ، خیر خیرات اور مجلسیں اب بھی ہوتی ہیں مگر بہت کم دس تاریخ کو اب کئی سال سے دس میں تعزیے کربلا جانے لگے ہیں خاموشی کے ساتھ

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

دہلی میں اردو

(گذشتہ سے پیوستہ)

(سیّد محمد باقر شمس لکھنوی ۔ کراچی)

شاہ عالم کے آخری زمانے میں دہلی میں کچھ امن ہوا کیونکہ وہ انگریزوں کی حمایت میں آ گئے اور کچھ چہل پہل نظر آنے لگی۔ شاہ عالم خود بھی شاعر تھے آخری عمر میں بصارت سے محروم۔ انتظام سلطنت سے سروکار نہیں شاعری سے دل بہلاتے لگے دربار میں شعرا کا جمگھٹا تھا شہر میں بکثرت مشاعرے ہوتے تھے جس میں وہ بھی اپنا کلام بھیجتے تھے۔ جراَت و انشا، مصحفی و رنگین کی شاعری خوب چمکی ان کی شاعری میں وہ حزن و یاس نامرادی اور ناکامی نہیں ہے۔ اس لئے کہ دہلی کے حالات بدل چکے تھے اس وقت کی شاعری دہلی کے حزنیہ دور کا ردعمل تھی جس میں انتہائی شوخی پھکڑ پن اور بے حیائی کے مضامین نظم کئے جاتے تھے۔

ادا جان لیتی ہے جانی تمھاری	غضب ڈھا رہی ہے جوانی تمھاری	جراَت
یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا	چنپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا	"
اس ڈھب سے کیا کیجے ملاقات کہیں اور	دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور	"
کیا رک کے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلوں	بس بس پرے ہو شوق یہ اپنے تئیں نہیں	"
عجب طرح کے مزے چاندنی میں دیکھے رات	قرار جا کے جو بر پشت بام میں نے کیا	انشاء
دو تین دن تو ہو چکے اب پھر چلو وہیں	فیروز شہ کی لاٹ کے اس جو تھے کھنڈر پر	"

ان لوگوں کی شاعری لکھنؤ کے سر تھوپی جاتی ہے حالانکہ فیروز شاہ کی لاٹ سے لکھنؤ کو کیا نسبت۔ یہ شاعری دہلی میں پھلی پھولی آخر زمانہ میں یہ لوگ لکھنؤ آئے اور اپنی شاعری کی بیہودگیاں ساتھ لائے۔ لکھنؤ میں مصحفی و انشاء میں جو کچھ ہوا وہ ان کے بعد کسی نے نہیں سنا

دہلی میں علمی حادثہ

اس وقت دہلی میں ایک بڑا علمی حادثہ ہوا جسکی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی جو ایک جلیل القدر عالم تھے انھوں نے ملا نصر اللہ کابلی کی کتاب صواقع محرقہ کو فارسی کا قالب دیا اور تحفہ اثنا عشریہ نام رکھ کے اپنے نام سے پیش کر دیا۔ ملا نصر اللہ کی کتاب نایاب تھی انھیں خیال ہوا کہ اس کا کوئی نسخہ سوائے ان کے اور کسی کے پاس نہیں ہے پھر بھی انھوں نے یہ احتیاط کی کہ پہلی مرتبہ یہ کتاب احمد حلیم ایک گمنام شخص کے نام سے پیش کی جب کسی طرف سے گرفت نہیں ہوئی تو پھر احمد حلیم کے ساتھ عبد العزیز بھی بڑھا دیا اور یہ ظاہر کیا کہ یہ میرا تاریخی نام ہے اتفاق سے صواقع کا ایک نسخہ لکھنؤ میں غفرانمآب کے کتب خانے میں تھا چنانچہ سلطان العلماء نے اس کتاب کی رد بوارق مولقہ کے نام سے لکھی اور اس میں ظاہر کیا کہ تحفہ اثنا عشریہ حقیقت میں تحفہ مسروقہ ہے اس وقت یہ راز کھلا۔

شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ثانی کا دور آیا اور غالب ذوق مومن نے شاعری میں علم امتیاز بلند کیا۔

ادھر لکھنؤ میں ناسخ و آتش نے زبان و شاعری میں اصلاح کی اور اسے زبان اور مضمون کے لحاظ سے سنجیدہ بنایا فحش اور بازاری

الفاظ اور انداز بیان متروک قرار دیا خواص کی زبان اختیار کر کے سلاست اور سنجیدگی پیدا کی انکا دیوان جب دہلی پہنچا تو غالب و مومن نے ان کی تقلید کی اور اپنی زبان و شاعری کو مہذب و سنجیدہ بنایا اور اس کا اعتراف کیا۔

دہلی میں دوسرا علمی حادثہ

اس زمانے میں دہلی میں دوسرا علمی حادثہ رونما ہوا۔ لکھنؤ میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے اُردو میں خطوط لکھنے کا رواج دیا اور پرانے طرز خطوط نویسی میں انقلاب پیدا کیا۔ پرانے القاب و آداب ترک کر کے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ سرور اور غالب میں دوستی اور خط و کتابت تھی۔ غالب نے سرور کا چربہ اتارا اور اسے اپنا مخصوص رنگ قرار دیکے پیش کر دیا۔

سرور کا ایک خط ملاحظہ ہو۔

قبلہ بندہ۔ تسلیم بجالاتا ہوں۔ جو کام نیا کرتا ہوں اس کی داد پاتا ہوں آپ کی پوسٹ ماسٹر تک رسائی ہے میں نے ہرکاروں سے رسم بڑھائی ہے گو ہم پلہ نہیں کم ہوں لیکن قدم بقدم ہوں۔ انشائے سرور

یہی شوخی یہی انداز بیان غالب نے اڑایا یہاں تک کہ سرور کی قافیہ بندی تک غالب کے یہاں موجود ہے۔

یہ خط بے تکلف دوستوں اور عزیزوں کو لکھے گئے تھے۔ جس میں وہ عبارت آرائی نہیں ہے جو سرور کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے اسے "بے رنگ من است" سمجھ کے سرور نے اشاعت کے قابل نہیں سمجھا۔ غالب نے بھی سرور کی طرح اپنے خطوں کی اشاعت کو ایک مدت تک اچھا نہیں سمجھا لیکن جب دوستوں نے واہ واہ کی تو اسے "نقشہائے رنگ رنگ" سمجھ کے کوشش سے لکھنا شروع کیا اور اس طرز کی ایجاد کا دعوی کرنے لگے یہ راز نہ کھلتا خدا بھلا کرے منشی نول کشور کا انھوں نے سرور کے بیٹے سے سرور کی تحریریں مانگیں ان میں یہ چند خطوط بھی تھے جو انھوں نے انشائے سرور کے نام سے شائع کر دیئے اور یہ راز کھل گیا۔

اس کے بعد غدر ہوا۔ رہی سہی دہلی پھر لٹی اور ہزاروں بے گناہ جس طرح مارے گئے، اس کا ایک دن کا نظارہ لارڈ رابرٹس نے یہ بیان کیا ہے:۔

"ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک میں گئے تو ہم کو شہر حقیقت میں مردوں کا شہر نظر آتا تھا کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سنائی نہ دیتی تھی کوئی زندہ آدمی نظر نہ آیا ہر طرف مردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا جن میں بعض حالت نزع اور جانکنی میں مبتلا تھے۔ ہم چل رہے تھے تو بہت آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے کہ ہماری آواز سے مردے چونک نہ پڑیں اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مردوں کی لاشوں کو کتے کھا رہے ہیں اور دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جمع ہیں جو ان کے گوشت کو نوچ نوچ کر مزے سے کھا رہے ہیں اور ہماری آمد کی آواز سے کچھ اڑ کر تھوڑے فاصلے پر جا بیٹھتے ہیں ہم کو بڑی عبرت ہوئی اور ہمارا دل رنجور ہو جاتا تھا بہت سے مردے ایسے پڑے تھے گویا زندہ ہیں بعض مردوں کے ہاتھ اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی طرف اشارہ کر رہے ہیں غرض ان مردوں کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی جیسے کہ ہم کو ان کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا ویسے ہی ہمارے گھوڑے ان کو دیکھ کر بدکتے اور ہنہناتے تھے۔ مردوں کی لاشیں پڑی تڑپتی تھیں ان کے تنفس سے ہوا میں بیمار کرنے والی بدبو اٹھ رہی تھی۔

ایک اور انگریز لکھتا ہے:۔

"دہلی کے باشندے اگرچہ سب ہنود اور تمام باشندے بے قصور شہر کے گرد و نواح دیہات اور جنگلوں میں پڑے ہوئے بلک رہے ہیں۔" ۱۸۵۷ء مرتبہ میاں محمد شفیع ۲۱۷ تا ۲۱۸

ہندوستانیوں کا خون اس طرح بہانے کے بعد جب انگریزوں کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا تو شہر کی آرائش کی طرف متوجہ ہوئے محلے کے محلے اور بازار کے بازار ڈھانے لگے اس سے بچے کھچے لوگوں کا ٹھکانا بھی نہیں رہا۔ مرزا غالب نے اپنے خطوط میں دلی کی اس تباہی کا نقشہ جا بجا کھینچا ہے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

یہاں شہر ڈھے رہا ہے بڑے بڑے بازار، خاص بازار اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا برسات بھر مینہ نہیں برسا اب تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔"

مرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں۔ صحاف اور نقاش کہاں؟

ایک خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو دہلی کی تباہی کی داستان یوں لکھی ہے :۔

صاحب! کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔

اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے۔ وہ دلی نہیں جس میں تم نے تحصیل علم کیا وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں اناث میں سے جو پیر زن ہیں کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں ہیں امرائے اسلام میں اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا۔ سو روپے روز کا پنشن دار۔ سو روپیہ مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیر زادہ۔ نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا تھا۔ بیمار پڑا نہ دوا، نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی احیا کو پوچھو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں ٹکے کی آمدنی نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے۔ مگر دیکھئے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے۔ بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے ضیاء الدولہ کی پانسو روپیہ کرایہ کی املاک واگذاشت ہو کر پھر غرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔

ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے؟ جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے علما اور زہاد کے باب میں

جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے ان کو بھی بھیج جانو۔ اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر آسیب کا گمان ہرگز نہ کرو خدا چاہے تو استعمال ایارجات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔ یکشنبہ ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء

عافیت کا طالب غالب

رئیس احمد جعفری نے بہادر شاہ اور ان کے دور کے حالات میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اس میں غدر کے بعد کے حالات یہ لکھے ہیں:-

صدہا عورتوں نے بدکاری کا پیشہ اختیار کر لیا راتوں کو برقعہ اوڑھ کر مسافروں کی سراؤں کے گرد قطاروں کی قطاریں مسافروں کے بلانے کے انتظار میں بیٹھی رہا کرتی ہیں اور اس طرح دو چار پیسے صبح کو کما لاتی ہیں بہت سی عورتوں نے اپنا سر منڈوا ڈالا اگر کوئی شخص کبھی ایک خمیری روٹی یا ایک مٹھی چنے یا کچھ کوڑیاں تقسیم کرتا تو صدہا مسلمان عورتیں جمع ہو جاتیں جن میں سے بعض عورتوں سے نجیب زادیاں معلوم ہوتیں جو خود کبھی صدہا روپیوں کی خیرات کرتی تھیں اب کوڑیاں مانگتی ہیں۔ جن کے آگے دو دو چار چار مامائیں کام کرتی تھیں اب خود ماماگیری کے قابل نہ رہیں۔ بعض بڑی عورتیں جن کی حسانیت پر فرنگیوں کو بھی رشک آتا تھا۔ اپنی خوش نصیبی سے بعض انگریزوں کے گھر بیٹھ گئیں۔ دہلی میں پہلے بہت کم طائفوں کے گھر تھے۔ اشراف کبھی اپنے محلوں میں آباد نہیں ہونے دیتے تھے پھر جب شہر آباد ہوا ہے تو ہر محلہ میں ایسے دو چار گھر ضرور تھے۔

منشی ذکاء اللہ کی زبانی

بہادر شاہ ظفر کی صاحبزادی احمدی بیگم کی داستان سنئے۔ احمدی بیگم کے شوہر مرزا منجھو جو غدر میں کام آئے بڑے دبدبے کے آدمی تھے ان کی سرکار بھی ہوتی تھی۔ بیسیوں آدمی ان کے دستر خوان پر بیٹھتے تھے دروازے پر نالکی پالکی موجود تھی۔ جب مرزا مارے گئے اور شہر کی حالت بگڑی تو بڑی بیگم نے اپنا اور بہو بیٹیوں کا تمام زیور خانم کے بازار والی حویلی میں گاڑنے کا ارادہ کیا دو پیٹیوں میں زیور بھرا ہوا تھا۔ ہزاروں کا مال تھا شہر کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ ردی ہو رہی تھی عین شب برات کے روز یہ سب شہزادیاں کھڑی ہوئیں احمدی بیگم کی ضعیفی میرا بچپن تھا انھوں نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ آخری دنوں میں وہ باہر نکلنے کے قابل نہ رہیں اور بہت تکلیفیں اٹھا کر یہ شہزادی دنیا سے اس طرح رخصت ہوئی کہ کفن تک میسر نہ ہوا۔

—— فالج نے بالکل بے کار کر دیا تھا چل پھر نہ سکتی تھیں اور کئی دموں کا گذارہ اس ایک دم کی محنت پر تھا۔ میری (منشی ذکاء اللہ) بارہ تیرہ برس کی عمر ہوگی کہ میری والدہ مرحومہ نے احمدی بیگم کا پتہ دے کر مجھے ایک روپیہ دیا کہ دے آؤ —— میں گیا۔ شہزادی کے گھر میں مٹی کے ٹوٹے برتن تھے اور سردی کے موسم میں بادشاہ کی اولاد دبکی اور سکڑی بیٹھی تھی احمدی بیگم اس روپیہ کو دیکھ کر جس قدر خوش ہوئیں اور جو دعائیں ان کے منہ سے نکلیں اس کا اظہار مشکل ہے۔ اس وقت ہنستا ہوا گیا اور ہنستا ہوا آیا۔ مگر آج جب اس جھلنگا چارپائی کا خیال آتا ہے تو تڑپ جاتا ہوں۔

شہزادیاں کسبیاں بن گئیں

وہ شہزادیاں جو جاہ و جلال کی زندگی بسر کر رہی تھیں طوائف اور

کسبیاں بن گئیں ۔

شہزادی کا نکاح باورچی سے متواتر فاقے رنگ دکھاتے ہیں کہ ربیعہ بیگم بہادر شاہ کی لڑکی کا نکاح حسینی باورچی سے ہوتا ہے ۔ ۔۔۔۔۔۔ منشی ذکاء اللہ اس شادی کا ذکر طنز و تعریض کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔

بہادر شاہ کی بیٹی ربیعہ نے اپنا نکاح حسینی باورچی سے اس لئے پڑھایا کہ روز تر دیگچی کھانے میں آئے گی ۔ فاطمہ سلطان جس کے باپ کے سر پر تاج شاہی رکھا جاتا تھا ۔ مشنریوں کے زنانہ اسکول میں وظیفہ داربن کے معلمی کا پیشہ سیکھا ۔ صہ ۹۸۴ تا ۹۸۶

میں نے دہلی کی تباہی کی داستان ذرا تفصیل سے اس لئے بیان کی ہے کہ آپ کو یہ اندازہ ہو جائے کہ دہلی کی صرف رونق اور دولت ہی نہیں لٹی بلکہ اخلاق بھی تباہ ہو گیا ان حالات میں تہذیب و تمدن سیرت و کردار اور زبان و خیالات میں پستی اور ناشائستگی پیدا ہونا ضروری تھی ۔

دہلی میں امرد پرستی عام ہونے کی وجہ سے تہذیب و شائستگی پہلے ہی سے مجروح تھی وہاں کے سنجیدہ اور اعلیٰ طبقہ میں بھی یہ مرض موجود اور اس طرح وضع میں داخل تھا کہ علانیہ اس کا اظہار کیا جاتا تھا ۔

جہانگیر نے اپنی تزک میں بھی اس کا ذکر کیا ہے ۔ اورنگ زیب کے عہد میں سرمد اور ابھے رام کا عشق تاریخوں میں موجود ہے ۔ جعفر زٹلی نے اورنگ زیب کے ایک لڑکے کو بھی اس مرض کا شکار بتایا ہے اور دہلی میں اس رسم کی عمومیت پر ایک "گاف مردا" نامہ لکھا ہے (میں نے گاف کر دیا ہے انھوں نے اپنی زبان میں صاف صاف کہا ہے) یہ گاف مردا نامہ ان کے کلیات میں موجود ہے اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

پان کھا کر گاف مردا کھیلئے	باغ جا کر گاف مردا کھیلئے
بادشاہی ہے بہادر شاہ کی	بن بنا کر گاف مردا کھیلئے
وقت آن آمد کہ دوہر بھیڑ بھاڑ	گھس گھسا کر گاف مردا کھیلئے
عطر مل کر چوتڑوں کے بیچ میں	مل ملا کر گاف مردا کھیلئے

عطر ملنا بتاتا ہے کہ طبقہ امرا میں بھی یہ ذوق پھیل چکا تھا حد یہ ہے کہ علماء فقہا اور صوفیا بھی اس میں مبتلا تھے مرزا مظہر جان جاناں جو عالم فقیہ اور صوفی سب ہی کچھ تھے ان کے متعلق تذکرہ گلزار ابراہیم میں لکھا ہے ۔

حسن پرستی سے دل بستگی تمام رکھتے تھے اور عشق حقیقی و مجازی سے کام انعام اللہ خاں یقین اور فقیہ صاحب درد مند ان کے شاگردان رشید سے کہاتے ہیں اور میر عبدالحئی تاباں بھی علیٰ ہذالقیاس اسی طرح گنے جاتے ہیں ۔ صہ ۲۱۶

انعام اللہ خاں یقین کے حالات میں اس کو اس طرح واضح کیا ہے ۔

منظور نظر میرزائے مذکور صہ ۳۶

محمد فقیہ درمند کے حالات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے ۔

"نظر کردہ مرزا مظہر جانجاناں"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی مرزا صاحب کے اس ذوق کا واضح الفاظ میں ذکر کیا ہے :-

برعنا جوانان نظرش بود　　ص ۱۸۲

تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے مصنف سعادت ناصر خاں مرزا صاحب کے متعلق لکھتے ہیں :-

میر عبدالحیٔ تاباں کی محبت میں زار و نزار تھا -

میر عبدالحیٔ تاباں کے متعلق تذکرہ گلزار ابراہیم میں جو کچھ لکھا ہے اس سے دہلی میں اس ذوق کی عمومیت کا اندازہ ہو سکتا ہے

تاباں تخلص میر عبدالحیٔ نام شاہجہاں آبادی نہایت عزیز و خوبصورت اور صاحب جمال تھا کہ ولی سے شہر میں بے مثال تھا ہندو مسلمان ہر گلی کوچے میں ایک نگاہ پر اس کی لاکھ جان سے دین و دل نذر کرتے تھے اور پرے کے پرے عاشقان جانباز کے بادیں اس لب جان بخش مسیحا دم کے مرتے تھے تکلف یہ ہے کہ اس رعنائی اور دلربائی پر خود بدولت بھی دل کھو بیٹھے تھے ——— اس لیلیٰ صفتی پر مانند مجنوں ہمیشہ سرگرم فریاد و آہ رہتے تھے یعنی سلیمان نامی ایک لڑکے کو چاہتے تھے، اور اس کے محو محبت میں باوجود وصل کے آٹھ پہر کراہتے تھے -

محمد رفیع سودا کو بھی ان کے عاشقوں کی فہرست میں لکھا ہے -

بلکہ مرزا رفیع سودا بنا بر یک نظر توجہ اکثر اشعار کو ان کے اصلاح کرتے تھے　ص ۸۲

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں میر احمد یار کے حالات بھی ایسے ہی لکھے ہیں :-

جوانے بود باکمال وجاہت کہ یوسف ثانی توان گفت و دراں زماں عالم عالم فریفتہ رخ نیکو و آشفتہ زلف او بود در وقت احمد شاہ ہنگامہ حسن او گرم بود این ہمہ شعرائے متوسطین مانند پروانہ دل خود را بر شعلہ حسنش می سوختند و نیز بایشاں صحبت می داشت .... میر ضیا سلمہ نظر الفت داشتند چنانچہ تاحال بر وقت کہ یاد او می کنند می گریند -

تذکرہ گلزار ابراہیم میں بھی ان کا ذکر اسی خصوصیت کے ساتھ موجود ہے -

احمد یار جوانے نہایت زیبا شاگرد میر تقی میر و محبوب میر ضیا در زمان احمد شاہ جمع شعرائے ریختہ تعلقہ بوے داشتہ اند -

میر حسن کے تذکرے میں ایسے بہت سے لوگوں کا ذکر موجود ہے -

جعفر علی خاں ذکی :-

سوائی رام راجہ بود بر و تعشق داشت -

محمد افضل افضل :-

برکدام ہندو بچہ گوپال نامی بود کہ عاشق شدہ -

نور اللہ :-

بریک فرنگی بچہ تعشق بہم رسانیدہ -

میر رضا علی رضا :-

بر شخصے وہب علی عاشق است -

محمد عظیم عظیم

برسادہ عذاران شیدا۔

میر مینگا۔

بر شخصے تعشق داشت

صلاح الدین پاکباز۔

بر سوہناد لکھن کہ قوال بچہ بود نظر الفتے می داشت۔

تذکرہ گلزار ابراہیم میں بھی ایسے بہت سے پاکبازوں کا ذکر موجود ہے۔

مہتاب رائے رسوا۔

بر منون نامی عاشق شدہ۔

محمد چاند رخشاں

بر زعفران نامی عاشق شدہ

مصحفی نے اپنے تذکرہ میں فدوی کے متعلق لکھا ہے۔

قدم در راہ امرد پرستی می گذاشت چند جا خانہ جنگی ہم کرد ۔ ہرکجا حسین تعشق ورزیدہ

میر تقی میر نے پرسرام کے عشق میں ایک مثنوی لکھی ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ ذکرِ میر میں جہاں انھوں نے دہلی کی تباہی پر افسوس کیا ہے وہاں اس پر بھی تاسف کیا ہے کہ بازار میں وہ حسین لڑکے اب دکھائی نہیں دیتے اس کے معنی یہ ہیں کہ دہلی میں اس طرح کے لڑکے بازاروں میں عام طور پر دستیاب تھے۔

میر غفر غنیمی کی وہ مشہور مثنوی جس میں انھوں نے شعراء پر تنقید کی ہے اس میں انشاء کو یہی طعنہ دیا ہے۔

آگے یعنی راد (پری زاد) تھے ہم گھوغنے (گھورنے) جاتے تھے اب سائغ (شاعر) بن گئے ہیں۔

دریلئے لطافت

اس اخلاقی پستی کو دیکھئے کہ انشاء کو طعنہ تو دیرہے ہیں لیکن اپنی دل بستگی کا اظہار کس بلند آہنگی سے ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کے ناقل خود میاں انشا ہیں۔

ملا عبدالمومن دہلوی جو ملا دوپیازہ کے نام سے مشہور ہیں احمد شاہی دور کے جید علماء میں تھے اور بہت ظریف الطبع انھوں نے ایک فرہنگ لکھ کے اس وقت کی سیاسی اقتصادی تمدنی معاشرتی حالات کی تصویر کھینچ دی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

البادشاہ	کاہل زبان	العلماء	مشتاق طعام
الوزیر	ہدف تیر آہ بیچارگان	الامیرزادہ	کون دہندہ بہوس
النواب	مجموعۂ تغافل	الامرد	رہنمائے شہوت
البیوقوف	کردری دیانت دار		
الیتزودن	نوکر ماہیانہ ناشخص		

نکبت وافلاس، خوف دہراس کی حالت میں خدا یاد آتا ہے فقر و درویشی، پیری مریدی کو عروج ہوتا ہے اور اس پردے میں امرد پرستی ہونے لگتی ہے۔ جب تاتاریوں نے اسلامی دنیا کو تہ وبالا کیا خوارزمیوں کی حکومت اور عباسی خلافت کو برباد کر کے عجم سے عرب تک خاک اڑادی امیرزادے اور شہزادے بھیک مانگنے لگے تو صوفیت کو عروج ہوا اور امرد پرستی شروع ہوئی مولانا شبلی نے یہ داستان اس طرح بیان کی ہے :-

اس زمانے میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا صوفیہ اور اہل نظر اس کو عشق حقیقی کی منزل اولین، قرار دیتے تھے اور ارباب ذوق کے لئے تفریح خاطر کا اس کے سوا کوئی سامان نہ تھا ـــــــ

گر دہے نشینند باخوش پسر   کہ ما پاکبازیم و اہل نظر

دہلی کی بھی اس وقت یہی حالت تھی شعراء امرد پرستی کا اظہار بڑی بے باکی سے کرتے تھے ۔

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی کا   جہاں جاویں وہاں اک آدھ کو ہم تاک رکھتے ہیں   آبرو

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے ۔   سلیم اللہ خانصاحب کے ڈیرے

وہاں دیکھے کئی طفل پریرو   ارے رے رے رے ارے رے رے ارے رے   سوز

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب ۔   اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں   میر

یاں تلک خوش ہوں امار دسے کہ یارب کریم   کاش دے حور کے بدلے میں تو غلمان مجھکو   "

جو لونڈا نام سن امرد پرستی کا چڑھے چو نکے   میں اس کو بیچ دے باتوں لگ جاتا ہو یوں لاسا   "

جب نہ تب ملتا ہے بازاروں میں میر   ایک طوطی ہے وہ ظالم سرفروش   "

فراق گورکھپوری نے سچ کہا ہے :-

" دہلی میں عشق کو صرف تنہائی ملتی ہے اور زیادہ تر امرد پرستانہ جذبات کے تجربے

نگار ریاض نمبر ۳ ۲۹۵ ء

دہلی کی زبان وشاعری اور تہذیب وتمدن میں جو بھونڈا پن اور ابتذال ہے وہ بالکل قانون فطرت کے موافق ہے ـــ حقیقت یہ ہے کہ زبان کی ابتدا عوام سے ہوتی ہے اور اس میں بھونڈا پن اور ناشائستگی کا ہونا ضروری ہے۔ خواص انہیں کی زبان کو کاٹ چھانٹ کر مہذب اور شائستہ بناتے ہیں لیکن اس منزل میں زبان صدیوں میں پہونچتی ہے دہلی میں یہ عمل شروع ہوا تھا کہ اس پر تباہی آئی اور اہل دہلی وہاں نہ رہ سکے اور لکھنؤ چلے گئے یہاں اطمینان اور خوش حالی نے شاعری کو چمکایا ۔ اور زبان کو درست کیا ان کے بعد اہل لکھنؤ نے زبان کو صاف کیا اور اس طرح کہ صدیوں میں زبان صفائی کی جس منزل تک پہنچتی ہے اس کو برسوں میں پہنچا دیا اور وہ اپنی لطافت وشیرینی میں فارسی کا مقابلہ کرنے لگی جس کی تقلید دہلی والوں نے اور ان کے ساتھ ہر جگہ کے شعراء وادباء نے کی لیکن جس طرح اور مقامات کی زبان میں بھونڈی لفظیں اور نامہذب فقرے تھے اسی طرح اس تقلید کے باوجود دہلی کی زبان میں بھی ناشائستگی باقی رہ گئی ۔

نثر میں دہلی کی فصیح اور ٹکسالی زبان میر امن کی باغ وبہار ہے خود انکا دعویٰ ہے کہ وہ دہلی کے روزمرہ میں لکھی گئی ان کے اس دعوے کو سب نے تسلیم کیا ہے ۔ اس کی بھونڈی لفظیں اور بازاریت ملاحظہ فرمائیے ،

تس پر رنگ برنگ کی شکلیں جدی جدی بنائیں ص۲

جب شہر کے دروازے پہ آیا ایک نعرہ مارا ________

اور ڈانٹ ڈپٹ کر للکارا بڑھو دو اپنے خاوند کو جاکر کہو کہ بہزاد خاں بلکہ مہر نگار کو اور شہزادہ کامگار کو جو تمھارا داماد ہے بانکے پکارے لئے جاتا ہے   ص ۲۱۳

کہیں پانی لڑھاتے ہیں غالب	ادبی خطوط غالب ص ۳۶
رواج کار کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا	آب حیات
عورتیں برسات میں کھم گڑواتی ہیں ۔	〃
ایک ایک حرف سے محبت کے آب حیات ٹپکتے ہیں ۔	〃
پھولوں کی گیند بن بنالائیں گے ۔	〃
استاد سے کہوالاتے ہوں گے ۔	〃
کھڑی چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے ۔	〃
پلنگ پر سے کھسل پڑا ۔	〃
مضامین عاشقانہ عجب تڑپ دکھاتے ہیں ۔	〃
جھن کو لوالانا	مرأت العروس نذیر احمد

مومن نمبر

نگار پاکستان کا خصوصی شمارہ

مرتبہ :- نیاز فتحپوری

مومن اردو کا پہلا غزل گو شاعر ہے جو شیخ حرم بھی ہے اور رند شاہد باز بھی، اس لئے اس کی شخصیت اور کلام دونوں میں ایک خاص قسم کی جاذبیت ہے ۔ یہ جاذبیت کس کس رنگ میں اور کس کس نوع سے اس کے کلام میں رونما ہوئی ہے اور اس میں اہل ذوق کے لئے لذت کام و دہن کا کیا کیا سامان موجود ہے اس کا صحیح اندازہ

مومن نمبر کے مطالعہ سے ہوگا

اس نمبر میں مومن کی سوانح حیات، معاشقہ، غزل گوئی، قصیدہ نگاری، مثنویات و رباعیات اور خصوصیات کلام کی قدر و قیمت سے متعلق اتنا وافر تنقیدی و تحقیقی مواد فراہم ہو گیا ہے کہ اس نمبر کو نظر انداز کر کے مومن پر کوئی رائے، کوئی کتاب، کوئی مقالہ یا کوئی تذکرہ مرتب کرنا مشکل ہے ۔   قیمت : چار روپے

نگار پاکستان ۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی ۳

مقاماتِ ناصری

خان بہادر میر ناصر علی مرحوم کے انشائیے

(صلائے عام سنہ ۱ء)

حُسنِ مقال

زمانہ کو شروع سے انقلاب پسند کہتے آئے ہیں لیکن کسی نے آج تک یہ نہ بتایا کہ انقلاب اس کی کس بات میں ہے اس کا حال ہمیشہ ایک سا چلا آتا ہے آج تک کسی نے اس کی حالت میں انقلاب نہ دیکھا۔ پہاڑوں سے پوچھئے جن کے سر پیران کہن سال کی طرح برف سے سفید ہو گئے کہ زمانے کو اسی طرح دیکھتے آئے۔ آفتاب نے آنکھ کھولکر اس کو اسی طرح دیکھا۔ چرخ پیر اس کے سامنے کا بچہ ہے زمانہ کے نہ آغاز کا پتہ ہے نہ انجام کا بلکہ جب کچھ نہ رہے گا تب بھی یہ ایسا ہی بنا رہے گا اس کی وضع میں فرق آیا ہے نہ آئے گا۔ ہزار برس پہلے جو بات تھی اب بھی وہی بات ہے وہی دن وہی رات ہے۔

انسان کی طبیعت جو انقلاب دوست واقع ہوئی ہے تو اس نے اپنے مزاج کے موافق گزشتہ و آیندہ، قدیم و جدید نئے و پرانے کا جھگڑا لگا دیا ہے ورنہ دنیا میں کوئی چیز نئی ہے نہ پرانی ہر نئی چیز پرانی ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ جسے ہم آج نئی سمجھتے ہیں کل پرانی کہلائے گی۔

لیکن دردمندانِ محبت سے پوچھئے۔ کہ ہماری آج اور ہے اور یار کا وعدۂ فردا اور ہے

وعدے پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار

اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

نہ جھوٹ بول کہ ہم شام سے کل آئیں گے!

قسم نہ کھا ارے جھوٹے کبھی جو تو آئے

ماہرانِ فن جانتے ہیں کہ ایک ہی رنگ میں ذرا سی کمی بیشی سے کتنا فرق ہو جاتا ہے۔ سُرخ دگیروا، اور گلابی لال رنگ ہیں مگر سب میں فرق ہے۔ بسنتی و زعفرانی گو زرد رنگ سہی مگر اس رنگ کے دوپٹہ والے جانتے ہیں کہ دونوں ایک رنگ نہیں خونِ جگر اور ہے اور حنائے دستِ یار کی سرخی اور ہے اشکِ خون آلود کی سرخی اور ہے۔ اور رنگِ شفق کی سرخی اور غصہ میں چہرے کی سرخی اور ہے اور نشہ مے سے آنکھوں کے ڈوروں کی سرخی اور ہے رنگِ شہاب اور ہے اور سُرخی لب لعلیں اور ہے یار کے چمپئی دوپٹے کی رنگت اور ہے۔ اور زردیٔ رُخِ عاشقاں اور ہے

مرغِ بسمل کا تڑپنا اور ہے ـــــ اور دل کا تڑپنا اور ہے!

اپنی پریشانی اور ہے اور پریشانیٔ زلف یار اور ہے!

نصیب کا بگڑنا اور مزاجِ یار کا بگڑنا اور ہے آگ میں جلنا اور ہے اور سوزِ ہجراں اور ہے۔ شمع کا جلنا اور ہے اور پروانہ کا جلنا اور خلعت شادی اور ہے اور شالِ عزا اور ہے۔ ع

صبح محشر اور ہے چاک گریباں اور ہے

مجرمانِ زلف آئے جس گھڑی دیوانہ وار!

صبح محشر چھپ گئی چاک گریباں دیکھکر

یہ مثالیں میں نے اس لیے عرض کیں کہ زمانہ کا انقلاب کبریا کی طرح محض خیال کا نام ہے۔ ورنہ اس سے زیادہ کیا بے پابندیٔ وضع ہو سکتی ہے۔ کہ جو سال فنا ہوتا ہے کوئے یار میں فنا ہوتا ہے۔ یعنی مادرِ گیتی کے آگے زالِ دنیا کے سامنے دم توڑتا ہے۔ وفا اس کا نام ہے کہ جتنے سال و ماہ ہوئے۔ اسی عالم میں پیدا ہوئے اور یہیں جان دی۔ نہ آسمان دیکھا نہ زمین دیکھی ؎

ہم گرے اُن کے در ہی پر مر کر

اور کوئی وفا کرے کیا خاک

لیکن وفا ہو یا بیوفائی۔ گزری باتوں کا ذکر اس وقت تقویم پارینہ کی طرح بیکار ہے ؎

دل جوانی میں دیا رنج نہ کر پیری میں

برسوں کے مُردہ کو روتے نہیں رونیوالے

آغاز سال میں آج سب سے بڑے خاندان کی تقریب کا ذکر ہے جس کی کیفیت سننے کے لائق ہے۔ اس کیفیت کا ذکر مجھ سے بن نہ پڑے یہ دوسری بات ہے مگر تقریب کے دلکش ہونے میں شک نہیں۔ پہلے آپ اس گھر کا حال سن لیں عالمِ اسباب میں آج نیچر سے بڑا اور قدیم گھر دنیا میں نہیں۔ آسمان اس کی چھت اور سورج۔ چاند ستارے اس کی قندیلیں ہیں۔ سبزہ و باغ غنچۂ گل فرش اور فرش کے بیل بوٹے سمجھیے۔ اس بزم نشاط کے لیے ٹوٹی فلک کو سائی دی گئی ہے۔ اور نغمہ پردازیٔ مرغانِ چمن کے حوالے ہے۔ عزیز یگانوں میں جو جمع ہوئے ہیں۔ مشاہیر عالم ہیں۔ پیرِ فلک، مادرِ گیتی، زمانہ، نیچر اور ان کا سارا گھر۔ جس میں ساری دنیا آگئی۔

ان کی آپس کی رشتہ داری کا حال یوں ہے کہ پیرِ فلک کی شادی گیتی نامی ایک بڑے گھر کی لڑکی سے ہوئی جس سے زمانہ پیدا ہوا۔ زمانہ کی رعنائی کی بڑی دھوم مچی، یہاں تک کہ عجبہ ہائے روزگار میں سے ایک آفت کی پرکالہ زالِ دنیا زمانہ سے رسم و راہ ہو گئی۔ زمانہ کا ان دنوں شباب تھا۔ اس کا مزاج اس عمر میں بھی کہ جوانی نہیں رہی۔ ایک حالت پر نہیں۔ سنا اس وقت تو ایک حالت پر رہنا ناممکن تھا ادھر زالِ دنیا کو پابندی کے نام سے ضد۔ زمانہ کی آوارگی دیکھکر گیتی نے بُڑھا نیچر کے مشورے سے پہلے پہلی صدی پھر دوسری صدی اس کے بعد تیسری صدی اور یکے بعد دیگرے انیسویں صدی تک سے شادی کر دی۔ یہ بیچاریاں سب گردشِ روزگار نامی ایک مہلک عارضہ میں گرفتار ہو کر مرتی چلی گئیں۔ اس سبب تیچھے سے معلوم ہوا کہ یونان کے مصور جو زمانہ کے سر پر بال نہیں بناتے تھے انھیں خبر نہ تھی۔ کہ اس کم بخت کے ماتھے میں کوئی منحوس بھونری ہے۔ جنوری کی پہلی کو آدھی رات پر ایک سیکنڈ کے بعد چھٹی شادی (یعنی بیسویں صدی کے

ہاں بچہ سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوا۔

اس تقریب کی خبر زالِ دنیا کو بھی ہوئی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے کہ پہلے اس کی رسم و راہ زمانے سے تھی اس سے رہا نہ گیا اس نے اپنے جی میں کہا کہ گو زمانہ مجھے زال کہتا ہے (یہ تو زمانہ کی عادت ہے کہ عیب لگائے بغیر چین نہیں) مگر دوسرا میری عمر کا اسقدر دلفریب کسی نے دیکھا نہ سُنا، کم سِن حسینوں کا جمال کچھ ناز کی بات نہیں۔ کہ مفت کی نعمت ہے، تعریف میری چاہیئے۔ کہ اب بھی میں جدھر دیکھ لیتی ہوں ایک عالم تڑپتا نظر آتا ہے، یہ بات مجھی کو نصیب ہے کہ جوان تو جوان بوڑھے مجھ پر زیادہ مر رہے ہیں۔ مجھے بھی لوڑھوں کی محبت زیادہ پسند ہے کہ ان سے رسوائی عشق کا اندیشہ کم ہے۔ کسی کو شبہ نہیں ہوتا کہ میری ان کی کیا رسم ہے۔ مگر کم بخت بری طرح چاہتے ہیں کوئی مجھ سے پوچھے کہ عشق ہے اور بڑھاپے کا ؏

پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است!

اس میں بڑا لطف یہ ہے کہ بوڑھوں کی محبت سے کوئی مطعون نہیں ہوتا۔ جوان جو مجھ سے محبت کرتے ہیں میرے غم خوار بنکر نہیں۔ بلکہ غلام بنکر رہتے ہیں۔ اور غلام سے میں غلام کے موافق پیش آتی ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب قید غلامی سے نکلا چاہتے ہیں۔ تو زنجیر قید سے باتدبیر نکلنا نہیں جانتے۔ زنجیریں کٹواتے نہیں۔ اپنی طاقت سے توڑتے ہیں۔ جس سے چوٹ لگ جاتی ہے۔ اور شور زیادہ ہوتا ہے میں کسی پر مرا نہیں چاہتی۔ میں نے دل سی چیز کو نکالکر پھینکدیا تو اب کسی کی محبت کو کیوں پاس رکھنے لگی۔

لیکن یہ تو بڑی بی نمود کی لے رہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ عورت کیسی ہی آوارہ مزاج کیوں نہ ہو۔ جیوں جیوں عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اولاد کا ارمان بڑھتا جاتا ہے کچھ تو بیسویں صدی کے زچہ خانہ کا رشک اور کچھ اپنے قدیم آشنا زمانہ سے رسم و راہ کو یاد کر کے زالِ دنیا بھی اس تقریب میں پہنچی۔

زمانہ کو دیکھے ہوئے مدت ہوئی تھی۔ اہل یونان کے خیالی تصویر کی طرح اس کے سر کے بال اڑے اور پیٹھ موڑے دیکھکر اس نے اسے نہ پہچانا۔

سامنے کھڑے ہو کر حال پوچھا تو بچے کی طرف اشارہ کیا اور پچھلی اولاد کی جدائی میں کچھ بڑبڑانے لگا کہ گردشِ فلکی نے ایک بچہ بھی جوان نہ ہونے دیا جو ساتھ دیتا۔ زالِ دنیا نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اپنے جی میں کہا کہ تعلقات دنیوی انسان کو مبہوت بنادیتے ہیں۔ پیدائش و موت کے جھگڑے انسان کو کسی کام کا نہیں رکھتے زمانہ کی عمر گو بہت ہی لیکن ایسا بھی کیا ہے کہ آدمیت ہی سے گزر گیا کہ میرے دل دکھانے کی جو بات تھی اس کا ذکر کیا جس سے مجھے اپنی اولاد نہ ہونے کا رنج ہوا عورت کے لیئے اولاد کا ہو کر مر جانا اس سے اچھا ہے کہ بانجھ رہے۔ عورت کے لیے زچہ خانہ سے زیادہ دلکش کوئی چیز نہیں۔ اس خیال میں یہ بیسویں صدی سے بھی ملنے لگی دیکھا۔ کہ زچہ ابھی کم سن ہے۔ بیسویں سال شروع ہے (دورِ گردوں میں ایک صدی ایک سال کے برابر سمجھئے) بیسویں صدی نے بھی زمانہ سے زالِ دنیا کا نام سُن رکھا تھا۔ دونوں بہت شوق سے ملیں۔ اسوقت ہم بچہ کا ذکر نہیں کیا چاہتے کہ کے دن کا ہے نہیں معلوم کیسا نکلے کیسا نہ نکلے اور زچہ نے ابھی دنیا اچھی طرح نہیں دیکھی اسکو تو یہ غم مارے دیتا ہے کہ جس طرح ۱۹ مجھ سے پہلے زمانے کی نذر ہو گئیں۔ میں بھی وہیں جانے والی ہوں۔ جہاں وہ گئیں اس پر زالِ دنیا نے سمجھایا کہ موت و زندگی کچھ چیز نہیں۔ جوانی میں انسان موت کو یار کی طرح ڈھونڈتا ہے۔ مگر موت جب

تک اس کا جی نہ چاہے مزاجِ یار کی طرح اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ یہاں تک کہ جوان اس کو بھول جاتے ہیں اور جب بھول جاتے ہیں تو پھر اس طرح گلے کا ہار ہو جاتی ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بچوں کو موت کی خبر نہیں ہوتی اور جوانوں نے موت کو ایسا آسان سمجھ رکھا ہے کہ محبت کا نام مرنا رکھ چھوڑا ہے لیکن جوں جوں عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ موت کے نام سے کانپتے ہیں

بوڑھوں کا عقیدہ ہے دگومنہ سے نہ کہیں، کہ دنیا کیسی ہی بُری کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد اگر اچھی بھی ہے تو یہ لاچاری قبول ہے۔ ورنہ یہ تمنا اور اپنا بس چلے تو بھی یہ بُری ہی بھلی ہے۔ اس لیے جب تک کہ میاں کے پاس سے تقاضہ کا بلاوا نہ آئے یہاں سے جانے کا نام لینا حرام ہے۔

جنھوں نے دنیا کو اچھی طرح نہیں دیکھا۔ وہ میرے (زالِ دنیا کے) مزاج میں تلوّن بتاتے ہیں۔ میں اپنی وضع کو تلوّن نہیں سمجھتی۔ اپنی زندگی کی غایت میں نے تحصیلِ کمال سمجھ رکھی ہے اپنی ہر وضع سے وہ بات پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ جس کی تلاش سنگتراش کو سنگ مرمر کی تصویر بنانے میں ہوتی ہے کہ تیشہ کی ہر ضرب گویا خط و خال کی خوبی کا سامان ہے۔ زمانے کو شکایت ہے کہ میں کسی کو چاہتی نہیں لیکن کسی کو نہ چاہنے سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ میں اپنے تئیں بھی نہیں چاہتی۔ مجھ میں یہ عیب البتہ ہے کہ کسی آشنا کو یاد نہیں رکھتی۔ آشنا کیا مجھے اپنی بھی یاد نہیں رہتی۔ بوڑھا ہو یا جوان کوئی میری طرف ہاتھ بڑھائے۔ مجھے محبت سے انکار نہیں میں کسی کو بلانے نہیں جاتی بلکہ علانیہ کہہ دیتی ہوں کہ جو جس کو روک سکے روکے۔

آغازِ شباب میں زمانہ نے فرطِ محبت سے مجھ سے کوئی نشانی یادگار کے لیے مانگی۔ میں نے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی اتار کر دیدی۔ زمانہ نے پوچھا کہ کس انگلی میں پہنوں۔ اس سوال سے یہ غرض تھی کہ رسمِ شادی کے موافق چڑھاوے کی انگلی میں پہن لے میں نے جواب دیا جس انگلی میں آئے۔ پہن لو مگر اس انگلی میں نہ پہنا جس میں چڑھاوے کی انگلی کی وجہ سے پھر اتارنے کی ضرورت پڑے میرا مطلب یہ تھا کہ جس بات میں کھٹکا رہے وہ مجھے پسند نہیں۔ اس بیان پر سننے والی (بیسویں صدی نامی زچہ) نے گھبرا کر پوچھا کہ تمہاری نگاہ میں وفا و محبت کچھ چیز نہیں۔

زالِ دنیا نے جواب دیا کہ وفا و محبت جس سے ہوسکے کرے مگر خیالِ حسن کو عشق کی زیادہ ضرورت ہے کھلم کھلا عشق بدنامی کا ڈر ہے اور چھپ کر عشق کرنا نہ کرنے کے برابر ہے۔ مرد کو خدا نے نگاہ و زبان و دماغ اور اسباب ایسے دیئے ہیں جن سے زندگی کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ علوم و فنون و لٹریچر کی خوبیاں اس کے جی بہلانے کو بہت ہیں۔ مگر عورت کو صرف ایک نازک سی چیز دی گئی ہے۔ جسے دل کہتے ہیں۔ یہ کہیں زخمی ہو گیا تو چوٹ کھائے سانپ کی طرح اس کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔ عورت کا کاسۂ دل ایسے نازک مسالے سے بنایا گیا ہے کہ خالی رہ جائے تو ذرا سی ٹھیس سے ٹکڑے ٹکڑے سمجھئے۔ محبت کے لیے وفا کیا۔ کسی تدبیر و فکر کی ضرورت نہیں۔ کیڑا بے دست و پا زرد پھول کی پتیوں میں گھر کر لیتا ہے اور پروانہ شبِ تار میں شمع کی لَو دیکھ لیتا ہے۔ قمری بے بتائے سرو کو پہچان لیتی ہے اور باغبان سے پہلے بلبل کو موسمِ بہار کی خبر ہو جاتی ہے۔ کوئل کو بغیر علمِ نباتات اور بے جنتری معلوم ہو جاتا ہے کہ آم کا درخت کب بَور لاتا ہے محبت وہ چیز ہے جو سامان و اسباب کی محتاج نہیں، اور بادشاہ کو بادشاہی کے لیے ملک درکار ہے سپاہی کو میدانِ جنگ فلاسفر کو علم و تحقیق کی ضرورت ہے۔ مگر محبت کے لیے ایک اکیلا دل چاہیئے۔ اس لیے جب تک دنیا میں دل سی چیز ہے۔ محبت کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ محبت کا داغ بڑا داغ سمجھا جاتا ہے۔ ماں باپ کا داغ بڑا داغ ہے۔ مگر نیچر نے سب کو اس کا عادی کر دیا۔ عورت کا پہلوٹھا بچہ جاتے اگر جنا زندہ ہے۔ عورت کو تسلی ہو جاتی ہے۔ کہ خدا پھر اولاد دے گا۔ ہاتھ پیر کی چوٹ ہو۔ اور کوئی درد کسی قسم کا کیسا ہی کیوں نہ

ہو۔ اس کا صدمہ روح کو نہیں ہوتا۔ روح کو صدمہ ہو تو رخصت ہو جائے اور درد اس سے پہلے ؏

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا ،

لیکن کسی کا داغِ محبت لطفِ زندگی کو کھو دیتا ہے مگر کوئی چیز کیسی دلکش کیوں نہ ہو تازگی بغیر لطف نہیں رات دن یہی سُننا کہ کسی پر مرتے ہیں عیش کو اجیرن کر دیتا ہے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ عالم اسباب کا مدار عیش پر نہیں۔ اس عالم کہن اساس کی بنیاد ہوا و ہوس پر نہیں رکھی گئی۔ اس کے سارے قصوں میں غم دنیا سب سے زیادہ ہیچ ہے۔ دنیا کا غم اُنھیں لوگوں کی نگاہ میں قابلِ اعتبار ہو تو ہو جن کو ترکِ دنیا کا دعویٰ ہے۔

عُمرِ رواں اور عُمرِ جاوداں

انسان کی بڑی شکایت یہ ہے کہ عمرِ جاوداں نصیب نہیں اس کی تمام عمر اسی رونے میں کٹتی ہے کہ اس عمرِ رواں میں کیا کیجئے اور کیا نہ کیجئے۔ عمر کی طرف سے اطمینان ہو تو کیا کچھ نہ کیا جائے۔ دولت جو آج آتی اور کل چلی جاتی ہے۔ فرصت ملے تو اس کو مضبوط پکڑ کر رکھیں۔ کمال جس کی حد نہیں حاصل کریں۔ اکسیر و کیمیا کے نسخوں کی تلاش کریں کہ جو لوگ تلاش کر گئے۔ عمر کے وفا نہ کرنے سے ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ تقدیر و تدبیر کے جھگڑے مٹائیں قیامت کے منکر و معتقد قیامت کا ہونا نہ ہونا قامت یار کی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ دجال پیدا ہو تو پہچان لیں۔ امام آخر الزماں کا ساتھ دیں۔ مگر کیا کریں۔ عمر وفا نہیں کرتی۔ عاقبت کے بورے سمیٹنے نصیب نہیں ہوتے۔ خاصکر بڑھاپے کی عمر تو بالکل چلتی پھرتی چھاؤں سمجھی جاتی ہے کہ کسی گنتی و شمار میں نہیں۔ بالوں میں سفیدی نظر آئی اور زندگی بیکار سمجھی گئی چہرے پر جھریاں دکھائی دیں اور لطف زندگی رخصت ہوا کہ بڑے بالوں میں کسی سے محبت کیجئے۔ یقین نہیں ہوتا چاہے آپ فرہاد و مجنوں سے زیادہ جان دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ نظیر اکبر آبادی نے بڑھاپے میں کسی سے محبت کی تصویر بلا کی کھینچی ہے ؎

سنتا ہوں کہ کہتی ہوئی پیہاری گئی ہے !

لو دیکھو بڑھاپے میں یہ مُت ماری گئی ہے

قیس کو بیاباں میں اور فرہاد کو بستیوں پردہ تنہائی نہ تھی جو بوڑھے کو بھرے گھر میں ہوتی ہے کہ وہاں ہر وقت خیال یار ساتھ تھا اور یہاں ہر شخص کو بوڑھے کے خیال سے بیگانگی ہے۔ جوانی میں خود بخود آپ کی طرف نگاہیں اٹھ جاتی تھی۔ اب کہے سے بھی کوئی مڑ کر نہیں دیکھتا۔ آگے نیم نگاہی جو کام کر جاتی تھی۔ اب عینک لگانے سے بھی وہ بات میسر نہیں۔ جوانی سے جس عورت کا ساتھ رہا اب مجھے گلے کا ہار دکھائی دیتی ہے۔ لڑکا جسے عصائے پیری سمجھ رکھا تھا کبھی دیکھنے نہیں آتا۔

بڑھاپے کی مت کا عجیب حال ہے جو باتیں ہم نے جوانی میں خود کیں وہی باتیں جوانوں کو کرتے دیکھ کر بڑا غصہ آتا ہے پہلے دنیا ہی دنیا پکارتے رہے اب اس کی ہستی میں بھی شبہ ہو رہا ہے۔ گو مزاج میں پارسائی پہلے بھی تھی۔ مگر کبھی

کبھی نماز قضا ہو گئی تو خدا کو غفور و رحیم سمجھ کر چپ ہو رہے۔ اب قضائے عمری کی ستر رکعتوں سے ایک رکعت بھی قضا ہو جائے تو گویا اس کی طرف سے آمرزش کا وعدہ ہی۔ لیکن عذاب قیامت سے دل کانپتا ہے۔ حالانکہ جوانی سے بوڑھاپا زیادہ مستحق رعایت سمجھنا چاہیے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ فقرا میں جن کو جس قدر پہلے مشاغل دنیوی میں مصروفیت رہی اسی قدر ترکِ دنیا میں ناموری حاصل ہوئی۔ شیخ صنعاں نے جس طرح دنیا سے نفرت پیدا کی تصوف کی کتابوں میں دیکھیے۔

حضرت پولس نے پہلے مذہب عیسوی کو بہت ستایا مگر آخر میں اس کی حمایت میں جان دے دی۔ وقت یہ ہے کہ انسان کی آرزوئیں اول تو بے گنتی جن کے پورا ہونے کے لیے ایک کیا ہزار عالم اسباب بھی کم سمجھیے دوسرے اس کی آرزوئیں بے تکی ہیں۔ بہت اونچی یا بہت نیچی۔ اس کا جامہ اس کے قد پر کبھی راست نہیں آتا۔ یا تو بہت ہی ڈھیلا ہے یا بہت تنگ۔ اونچی آرزوئیں تو ایسی اونچی کہ خالق سے وصال نفس سے دشمنی۔ دنیا سے بیزاری یہ نیکیوں میں سمجھیے۔ نیچی آرزوئیں تمام دنیا کی دولت میرے پاس آ جائے۔ دنیا مرا کرے میں جیوں۔ دنیا کے حسین مجھی کو چاہیں میری جوانی میں فرق نہ آئے۔ اس کی آرزوئیں قرینے کی کبھی نہ دیکھیں۔ ؎ مجھے برطارم اعلیٰ الخ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ آپ تکلیف پاتا ہے اور اوروں کو تکلیف دیتا ہے اس کی آرزوئیں اگر اندازے کی ہوں۔ تو تکلیف کی کوئی وجہ نہیں۔ عمر طبعی کی جگہ عمر جاوداں کی ہوس۔ اور بڑھاپے میں جوانی کا خیال۔ یہ بے تکا پن خراب کر رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ بڑھاپے کو آپ برا کیوں سمجھیں۔ نیچر کی ہر چیز دلکش ہے۔ اور بوڑھاپا بھی نیچر کی ایک صورت ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ پرانی عمارتیں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں قطب کا مینار۔ تغلق آباد۔ فتحپور سیکری کو لوگ دور دور سے دیکھنے آتے ہیں۔ پرانا درخت اچھا لگتا ہے اور زیادہ سایہ دار ہوتا ہے پرانے قلعے کو بہت دیکھنے جاتے ہیں۔ پرانی کتابوں۔ پرانی تصویروں پرانے اسکول کی تلاش ہوتی ہے۔ کیا انسان اپنی بنائی ہوئی چیزوں سے بھی گیا گزرا ہے۔ شام کا وقت کیسا سہانا ہوتا ہے۔ بوڑھاپا نیچر کی شام سمجھیے۔ لڑکوں سے پوچھیے تو کم سنی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ جس لڑکے کی عمر آٹھ برس کی بتائیے۔ کہے گا نہیں۔ بارہ برس کی ہے جب تک خط نہیں آتا۔ خط نکلنے کی جلدی ہوتی ہے۔ بڑھاپا کیسی ہی بیوقوفی کا زمانہ ہو۔ مگر عقل میں جوانی سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

بڑھاپا زمانے کی یادگار ہے اور فسانہ گردش روزگار ہے۔ بوڑھے جانتے ہیں کہ گرگٹ تو وہی ہے۔ گو دھوپ میں رنگ بدلے۔ تو بدلا کرے۔ چادر وہی ہے گو بیل بوٹے کچے پکے رنگ کے ہوں۔ تو ہوا کریں۔ صفحۂ ہستی وہی ہے جو دیکھ چکے۔ حرفوں کا الٹ پھیر جس طرح چاہے کیا کیجیے ؎ بہر رنگے کہ خواہی جامہ الخ۔ جوانوں کے لیے موت مصیبت ہو تو ہو۔ بوڑھوں کے واسطے دنیا سے جدائی ایسی ہے، جیسے پھل کی درخت سے کہ پھل جہاں پکا اس کا درخت سے جدا ہونا ضرور ہے۔ بڑھاپے میں دنیا سے جدائی بڑی نعمت ہے کہ اس وقت انسان دیکھنے اور دکھانے کے لائق نہیں رہتا۔ اس کا دل مرجھانے سے پہلے چہرہ مرجھا جاتا ہے۔ اس کے لیے موت سے بہتر چارہ نہیں۔

میں ابھی اسی خیال میں تھا کہ ہوائے ہستی مجھے اس بستی میں لے گئی۔ جہاں کے چند باشندوں کو اسا کہ عمر جاوداں سے حصہ ملا ہوا تھا۔ ان کا حال سننے کے لائق ہے۔ اس بستی کے بزرگوں کی زندگی میں پچیس برس تک تو اسی طرح گزرتی ہے۔ جس طرح کہ اور معمولی عمر کے لوگوں کی۔ تیس کے بعد الجھن اور ہوس بڑھنی شروع ہوتی ہے جو پچاس

ساٹھ برس کی عمر تک رہتی ہے۔ اس عمر میں ہاضمہ میں فتور ہو جاتا ہے۔ کوئی غذا مزاج کے موافق نہیں ملتی۔ ہاتھ پیروں میں پھرتی نہیں رہتی۔ یار کو دوڑ کر گلے لگانے میں جو بجلی سے زیادہ تیزی تھی۔ جاتی رہی۔ اب کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے اور گھٹنے پکڑ کر بھی کوٹھے پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس میں صرف یہی شکایتیں اور عیوب جو پیری کے لیے لابد ہیں۔ لاحق حال نہیں ہوتے۔ بلکہ جیوں جیوں عمر بڑھتی ہے۔ شکایتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور زندگی کے لطف کم ہوتے جاتے ہیں۔ اپنے سوا کوئی کسی کی کوئی بات سننے کو جی نہیں چاہتا تمنائیں ایسی جن کے پورا ہونے میں کوئی جوشں نہیں بالوں میں خضاب لگایا تو سب سے پہلے اسی نیک بخت نے جان لیا۔ جس کی نگاہ میں جوان ہونا منظور تھا۔ ہونٹ کیا چبائیں کہ دانت رخصت ہو چکے۔ لکھنے پڑھنے کا مشغلہ اس وقت برا نہ تھا۔ مگر حافظہ کا یہ حال ہے کہ فقرہ کے آغاز سے انجام تک ساتھ دینا مشکل ہے کہ شروع کچھ کیا تھا اور کہہ کچھ گئے۔ اس کے سوا زمانہ میں جو انقلاب ہمیشہ رہتا ہے کہ آج کی رسم کل بدل جاتی ہے اور کل کی پرسوں۔ اس لیے زمانہ کی راہ و رسم سے اتفاق نہیں رہا۔ نتیجہ یہ کہ اپنے گھر اور اپنے ملک اور اپنے عزیزوں میں بھی بیگانوں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔ زیادہ عمر ہو جانے سے اکثر عزیز بیگانوں، دوست آشناؤں کی موت سے زندگی تلخ ہو گئی۔ جہاں شراسی برس کی عمر میں میتیں ہیں خدا جانے آگے کیا ہوتا ہے وہاں کے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ بڑھاپے کی تکلیفیں ایسی ناگوار نہیں۔ جس قدر کہ یہ مصیبت کہ موت کا سہارا نہیں جس سے امید ہو کہ خدا ایک دن بڑھاپے کی تکلیفوں سے چھڑائے گا۔

دل ایوس را تسکین بمردن میتوان دادن!
چہ امید است اخر خضر دا درس مسیحا را

یہ حال دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ واقعی خدا کی بڑی مصلحت ہے۔ جو دنیا میں عمر جاوداں کا جھگڑا نہیں۔ ورنہ اس میں جینا مشکل ہو جاتا۔ اور یہ عمر رواں بیکار ہو جاتی ہے۔

پھر ہے جینے کی تمنا دم محشر افسوس
گور میں ہیں ستم عمر رواں بھول گیا

انتقادیات

مولانا نیاز فتحپوری کے معرکتہ الآرا ادبی۔ تحقیقی مقالات کا مجموعہ جن کی نظیر نہیں ملتی ہر مقالہ اپنی جگہ حرف آخر اور معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو زبان اردو شاعری، غزل گوئی کی رفتار ترقی اور ہر بڑے شاعر کا مرتبہ متعین کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ کتاب اسی اہمیت کی بنا پر پاکستان کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اعلےٰ امتحانات کے نصاب میں داخل ہے ——————— قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

نگار پاکستان ★ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی نمبر ۳

شہباز اور آزاد عظیم آبادی[1]

میدانِ سخن کے دو پہلوان

پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

عمر کے لحاظ سے دونوں برابر کی جوڑ تھے۔ جسمانی قویٰ کے لحاظ سے سید عبد الغفور شہباز دائم المرض اور نازک اندام، اور سید فضل حق آزاد قوی ہیکل دراز قامت تھے۔ دونوں ۱۸۵۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور انیسویں صدی کے ربع اخیر سے بیسویں صدی کے آغاز تک عظیم آباد (پٹنہ) ان کمالِ فن کا اکھاڑا رہا۔ آزاد نے ۸۸ کی عمر پائی مگر افسوس

---

[1] یہ دونوں بزرگ راقم الحروف کے باپ کی عمر کے تھے۔ شہباز سے تو کبھی ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔ مگر حافظ فضل حق آزاد سے اتنی تفاوت عمر کے باوجود برسوں بے تکلف صحبت رہی اور راقم سے شفقت ہی نہیں، دوستانہ محبت کا برتاؤ رکھتے تھے۔ مرحوم کی ایک کمزوری یہ تھی کہ کسی کی عظمت گوارا نہ کرتے تھے۔ جہاں کوئی غزل کسی رسالے میں دیکھ لی، حسرت موہانی کی ہو یا شاد کی یا اقبال کی اسی زمین میں اس کا جواب موجود۔ بڑے طباع، پرگو، ہمہ گیر، ساتھ ہی ساتھ بلند بانگ، دلیر، بے باک اور اکثر برخود غلط۔ زورِ طبع میں حسِ توازن کھو بیٹھتے، اپنے سہو و خطا یا کسی کی عیب جینی پر اڑ جاتے تو پھر ٹلتے نہ تھے۔ ان کا سامع ان کا کلام سُن کر خاموش رہ جاتا تو اس کی شامت آجاتی۔ خیریت تھی اور مصیبت بھی کہ بہت گراں گوش تھے۔ بے اُستادے تو تھے ہی، اس انداز مزاج نے عمر بھر ان کو آپ اپنی اصلاح کا موقع نہ دیا جو کمالِ فن کے لیے ناگزیر ہے۔

ان کی گراں گوشی کا ایک واقعہ لطف سے خالی نہیں۔ ایک دفعہ مولانا شبلی پٹنہ میں وارد تھے۔ ایک صحبت میں آزاد بھی تھے۔ راقم بھی حاضر تھا۔ مولانا نجی صحبتوں میں بڑے بذلہ سنج تھے اور آزاد بھی۔ لطیفوں پر لطیفے چل رہے تھے۔ آزاد کانوں کو ہاتھوں سے جھکائے سُننے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر بولے "جب کوئی لطیفہ ہو تو زور سے پکار دیجئے لطیفہ۔ میں بھی سُننے ہنسی میں شریک ہو جاؤں گا" پھر سنجیدہ گفتگو ہونے لگی۔ اسی درمیان میں مولانا پکار اُٹھے۔ لطیفہ آزاد سمجھ گئے۔ بولے" لطیفہ تو تھا نہیں اب ہو گیا"۔ اس پر قہقہہ لگا۔

ہے کہ شہباز اپنے عہد عروج فن میں ۵۳ کی عمر میں وفات پا گئے۔ مگر اتنی ہی عمر میں علم و فن اور شعر و سخن کے وہ کرشمے دکھائے کہ اہلِ نظر حیران رہ گئے۔

یہ دونوں پہلوانانِ سخن نے ویسے ہر رنگ میں کرتب دکھائے مگر جس صنف نے ان کو ممتاز و مقبولِ عام بنایا وہ نظم ہے یعنی خاص خاص موضوعات پر طبع آزمائی۔ غزل ایک امتیازی صنف سخن رہی ہے مگر نظم گوئی ہر شخص کے بس کی چیز نہیں۔ ۱۹۰۶ء میں شہباز کے انتقال کے وقت محمد حسین آزاد اور حالی دو نمونے، اور اسمٰعیل میرٹھی کو بھی شامل کر لیجئے تو تین، موجود تھے۔ البتہ اکبر الٰہ آبادی اور اودھ پنچ لکھنؤ کے خاص کھلاڑی تھے، اور ظریفانہ رنگ میں غزلیں اور نظمیں لکھا کرتے تھے مگر ان کی طنزیات کا دائرہ مذہب و معاشرت تک محدود تھا، اور صرف اسی کی اصلاح مقصود تھی۔ اقبال کا عہد طلب علم تھا یا آغاز مشق سخن۔ اُس وقت نظم گوئی میں امتیازی ہنر دکھانا غیر معمولی بات تھی۔

اُس زمانے میں ایک طرف آزاد عظیم آبادی نے برق جولاں شفق، ترانۂ دہقاں، حسن و حسنِ ادا، چیونٹی اور مکھی، مرغ قفس، کمال نقش، شبنم، جاڑوں کی دھوپ، شب تاریک، عقل و عشق، موت، امیر و مزدور، صریر قلم، وقت، علم و تعلیم، تربیت اخبار، صنعت و ایجاد، جگنو، قحط، سرسید مرحوم، ماہِ صیام، مہمانِ فلسطین (محمد علی جوہر)، حیات و موت اور سینکڑوں موضوعوں پر نظمیں لکھیں۔ دوسری طرف شہباز نے نہ صرف زر، ہیرے اور کوئلے کا مناظرہ، بچوں کو دودھ پلاتی گیتا، آموں کا بچپن، حضرت رمضان کا فوٹو، ڈاڑھی، صبح پیری، بھوک، کوہ آتش فشاں، زمزمۂ زندگی، آب رواں (بطرز سودی)، نظمیں و پاکیزہ تراجم از انگریزی مثلاً گولڈ سمتھ کی دہرمٹ کا ترجمہ جوگی نامہ، زمزمۂ زندگی۔ ابراہیم بن ادہم وغیرہ بیسیوں نظمیں لکھ کر اردو شاعری کے خزانے میں بیش بہا دلکش زندگی بخش، اور تخیل پرور اضافے کئے بلکہ مستقل قیمتی تصنیفات و تالیفات پیش کیں۔ تالیف، ترتیب، تصحیح و تبصرہ کلیاتِ نظیر اکبرآبادی، سوانح آزاد و خیالاتِ آزاد (نواب سید محمد ڈھاکا) کا مقدمہ، تفریح الطفل (بچوں کے لیے نظمیں) رباعیات شہباز، نثر میں مقالات جمالیہ و رد نیچری (ترجمہ جمال الدین افغانی)، موعظہ حسنہ (مکتوبات ڈپٹی نذیر احمد) شائع کئے۔ اس اعتبار سے، نیز زبان پر قدرت، اختراعات، پاکیزگی و صفائی اور افادیت کے لحاظ سے وہ نمایاں طور پر اپنے حریف آزاد عظیم آبادی پر سبقت لے گئے۔ دوسری طرف ان کے حریف نے زورِ طبع دکھلانے اور دُور کی کوڑیاں لانے میں جا بجا ٹھوکریں کھائیں۔ صرف چند نظمیں اور منتخب اشعار ان کی طباعی کا سرمایہ رہ گئے۔ باقی تبرکات۔

آویزشیں

یہ دونوں پہلوان ایک دوسرے سے دست و گریباں رہے۔ ایک نے دوسرے کی غزلوں کے صرف جواب نہیں لکھے بلکہ ہجو و ہزل اور فحاشی تک نوبت پہنچ گئی اور فاول (FOUL) کرتے رہے۔ افسوس ہے کہ اس میدان میں بھی شہباز نے زیادہ زور دکھایا اور غلاظت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ دونوں پہلوانوں کے حامی عظیم آباد میں موجود ہیں۔ اور ان پر تحقیقاتی کام جاری ہیں۔ ان کا پورا کلام امید ہے جلد منظر عام پر آجائے گا۔

ان کی زندگیوں کا اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ زمانہ کی عام رو میں بہہ کر اور چھوٹ بھیوں کی طرح یہ دونوں بھی ہمیشہ اپنے سے کبیر السن اور مشاق استاد غزل، شاد عظیم آبادی سے الجھے رہے۔ گو شاد

نے کبھی کسی کو منہ نہ لگایا۔ نہ کبھی حریف بن کر میدان میں اُترے مگر اعتراضات ہی نہیں ہجوگوئی کی بوچھاڑیں تمام عمر جاری رہیں۔ ان میں بھی آزاد عظیم آبادی نے زبان کی رکاکت اور دنارت سے کام نہیں لیا جو شہباز نے دکھائی۔ بازاری فحاشی پر اُتر آئے۔

باایں ہمہ شہباز علمی دنیا میں وہ مستقل نقوش چھوڑ گئے جو آزاد عظیم آبادی کو نصیب نہ ہوئے اور آزاد بہار سے باہر زیادہ روشناس نہ ہو سکے۔ جہاں تک فن غزل گوئی کا تعلق ہے آزاد عظیم آبادی اس بلندی پر پہنچ گئے جہاں تک ان میں سے کسی کی رسائی نہ ہو سکی۔ نہ سہی۔ شاعری صرف غزل گوئی تو نہیں اور میدان بھی تو ہیں۔ ان میں شہباز نے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یہ سب بارگاہِ ایزدی میں پہنچ گئے اور ہمارے محاسبہ و موازنہ سے بے نیاز و بلند تر۔ اللہ ان کی روحوں پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

اب تک ان پہلوانانِ سخن پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور جس کا بہار کی مجالس سخن میں چرچا ہے اس کے لیے ملاحظہ ہوں:

(۱) فکر و مطالعہ از پروفیسر زکی الحق

(۲) مطالعہ آزاد از پروفیسر زکی الحق۔ کتاب منزل پٹنہ ۴

(۳) راقم کا مقالہ یادِ شہباز مطبوعہ ساقی کراچی ۵۔ بابت جنوری و فروری ۱۹۶۲ء

(۴) معاصر پٹنہ۔ شمارہ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ مقالہ ڈاکٹر اختر ارینوی "شہباز کی شاعری"

ملنے کا پتہ پروفیسر عبدالمجید ۵۷ شرف آباد۔ کراچی ۵

جوگی نامہ

از شہباز عظیم آبادی

کسی زبان سے کسی زبان میں شعر کا کامل ترجمہ قریب قریب ناممکنات سے ہے۔ خیالات اخذ کئے جا سکتے ہیں مگر شاعری کی اور خصوصیات مثلاً صنائع لفظی و معنوی۔ بندش، آہنگ، طرز ادا، زبان کی چاشنی، حسن مجموعے سے شعر عبارت ہے، پیدا نہیں کی جا سکتی، شعر کی یہ تعریف ہر کلام منظوم پر صادق نہیں آتی۔ مثلاً منظوم داستانیں نامے، مکتوبات یا فنی مسائل جیسے دواؤں کے نسخے، قواعد صرف و نحو وغیرہ۔ ان کے کامیاب ترجمے ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ مگر جسے صحیح معنوں میں شعر کہیں اس کا ترجمہ شاذ و نادر کامیاب ہوا ہے۔ ایسا ترجمہ ایک فنی معجزہ ہے۔ ایسے نوادر میں صرف دو کامیاب ترجمے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ایک تو سید علی حیدر طباطبائی مرحوم کا غریبان جو ترجمہ ہے گرے (GRAY) کے مرثیے (ELEGY) کا جو اس نے ایک گاؤں کے گورستانِ عام پر لکھا تھا اور بہت مشہور و معروف ہے۔ دوسرا پروفیسر سید عبدالغفور شہباز مرحوم کا جوگی نامہ جو ترجمہ ہے ادلیور گولڈ اسمتھ کی ایک نظم (THE HERMIT) کا، جو اب سے ساٹھ چونسٹھ سال قبل شائع ہوا مگر اب نایاب ہے اور

شاعر کے ساتھ طاقِ نسیان کی نذر ہو چکا ہے

یہیں ساقی کراچی کے شمارہ جنوری فروری ۱۹۶۵ء میں شہباز اور ان کے نمونۂ کلام کو قارئین سے متعارف کر چکا ہوں اس سلسلہ میں ان کی مترجمہ نظم جوگی نامہ ( ) پر اظہار تاسف کیا تھا اور ان کے قدردانوں سے اس کے تجسس کی درخواست کی تھی۔ اس درمیان میں حسنِ اتفاق سے سفر ہندوستان میں کتب خانہ مشرقیہ (اورینٹل پبلک لائبریری) عظیم آباد پٹنہ میں جوگی نامہ کا ایک مخطوطہ نسخہ اور نایاب نظموں کے ساتھ جو مولوی سید ابوالعاص مرحوم عظیم آبادی ثم کراچوی کا ہدیہ ہے، میری نظر سے گزرا نسخہ اتنا بدخط شکستہ ہے کہ سب شعر تو پلے نہ پڑے مگر جوگی نامہ جو کبھی پڑھ چکا تھا اسے نقل کر لیا۔ گو بعض مقامات مشکوک رہ گئے اور حاشیہ پر ان کی نشان دہی کر دی۔ جیسا بھی ہاتھ آیا

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

خصوصیت

زبان و خیال

اس کی زبان خالص ہندی بھاشا ہے، سنسکرت آمیز نہیں، جو دو صدی پیشتر ہندو شریف گھرانوں کی زبان تھی، تخیل بھی قدیم ہندو معاشرہ کے مطابق ہے۔ گو ترجمہ حتی الامکان لفظی ہے مگر مترجم نے اس کوشش میں مکھی پر مکھی نہیں چپکائی ہے اور زبان کو مقامی سانچے میں ڈھال کر اپنا لیا ہے ۴۲ بندوں کی پوری نظم میں کوئی عربی یا فارسی کا استعمال نہیں کیا۔ آخری دو بند طبعزاد ہیں۔

ہیئت

صرف ترجمہ ہی نہیں، ہیئتِ نظم میں بھی اصل کی پابندی کی گئی ہے۔ ہر بند کا پہلا مصرع تیسرے کا، اور دوسرا چوتھے کا ہم قافیہ ہے۔ اس پابندی میں بھی تکلف اور آورد کا دخل معلوم نہیں ہوتا اور جب تک نشان دہی نہ کی جائے یہ رعایت قوافی محسوس نہیں ہوتی۔

دشواری عروض

ہندی عروض اردو فارسی سے بہت متغائر ہے اور اتنی مایہ دار نہیں۔ زیادہ تر نظموں میں بحر متدارک فعلن فعلن فعلن فعلن اور اس کے اضافات مستعمل ہوتے ہیں۔ ارکان کی تعداد میں بھی ہمیشہ مساوات دہماری نہیں ہوتی۔ پھر بھی نظم پڑھنے اور سننے میں موزوں معلوم ہوتی ہے۔ میں اپنے عروضی قاعدے سے ہر مصرع کی تقطیع سے قاصر ہوں، اور اسے ہندی عروض سے اپنی ناواقفیت پر محمول کرتا ہوں۔ اس بحر کو اصل انگریزی بحر سے بہت مماثلت ہے اور شاعر کا یہ انتخاب بھی قابلِ داد ہے۔

بہرحال یہ نظم ترجمہ نہیں نظر آتی۔ پھر بھی ترجمہ کس قدر لفظی اور مطابق اصل ہے اس کا موازنہ کرنے اور مترجم کی قدرتِ زبان کا اندازہ لگانے کے لیے ترجمہ کے پہلو بہ پہلو اصل انگریزی نظم بھی بتمامہ نقل کی جاتی ہے۔

افسوس ہے کہ یہ انگریزی نظم بھی جو کبھی انگریزی مدارس میں عام تھی اب پاکستان میں پڑھی پڑھائی نہیں جاتی اور کراچی کے کسی کالج کے کتب خانہ میں دستیاب نہ ہوئی۔ میں برٹش کونسل کراچی لیبریری کے لیبریرین مکرمی جناب ایوب صدیقی صاحب کا احسان مند ہوں کہ انھوں نے تجسس کی زحمت اٹھا کر ایک ضخیم مجموعہ منظومات سے اس کی نقل مرحمت فرمائی۔

THE HERMIT

1

"Turn, gentle hermit of the dale,
And guide my lonely way,
To where yon taper cheers the vale,
With hospitable ray.

2

"For here, forlorn and lost I tread,
With fainting steps and slow;
Where wilds immeasurably spread,
Seem longthening as I go."

3

"Forbear, my son," the hermit cries,
"To tempt the dangerous gloom;
For yonder faithless phantom flies
To lure to thy doom.

4

"Here to the houseless child of want,
My door is open still,
And tho' my portion is but scant,
I give it with good will.

5

"Then turn to-night, and freely share,
What'er my cell bestows;
My rushy couch, and frugal fare,
My blessing and respose.

جوگی

۱

"مڑ پیار سے جوگی گھاٹی کے
لے چل ۔ ہے باٹ کٹھن
اُس جلتی بتی تک جس سے
ہے جگمگ سارا بن"

یاں بھٹکا بھٹکا ... ہوں
ہیں سو سو ...
جنگل یہ ... کاٹوں
رہتے ہیں جو اک ٹھاکر

۳

"تھم جا" بولا جوگی
"جس میں ہو دکھ بے کم
وہ بتی ہے راکس کوئی
ہے گھات میں تیری ۔ تھم

۴

بے گھر کے بے بس بچوں پر
یاں کھلا ہے مرا دوار
سائیں کی دین ہے جتنی بھی
لے لے کوئی ہانک پکار

۵

اس رات تو آ ۔ جی کھول کے لے
ہے بھنڈار سے میں جو
بھر پیٹ تو روکھے بھوجن سے
رہ گھسری کھاٹ پہ سو

6

"No flocks that range the valley free,
To slaughter I condemn:
Taught by that power that pities me,
I learn to pity them.

۶

جو ریوڑ چپ چاپ پھرتے ہیں
کیوں مار دوں ان کا سیو،
کیوں ترس نہ کھاؤں ان پر میں
جب کھائے ہے مجھ پر شیو

7

"But from the mountain's grassy side
A guiltless feast I [illegible]
A scrip with herbs & fruits supply'd,
And water from the spring.

۷

ہیں پربت پر جو ساگ اور پات
بن دوس کے ہیں بھوجن
پھل پھول پہ کٹتی ہے دن رات
ہوں کنڈ کے جل میں مگن

8

"Then pilgrim turn, thy cares forego;
All earth-born cares are wrong;
Man wants but little here below,
Nor wants that little long."

۸

پیارے بٹوہی سوچ نہ کر،
ہے بھول یہ سوچ بچار
ہاں جگ میں چاہیے تھوڑا بھر
سو وہ بھی کبھو کبھار"

9

Soft as the dew from heav'n descends,
His gentle accents fell:
The modest stranger lowly bends,
And follows to the cell.

۹

یہ سلجھی باتیں جوگی کی،
سن داس سے بٹوہی بھرا
تھے آگے آگے جوگی جی،
وہ پیچھے پیچھے چلا

10

Far in a wilderness obscure
The lonely mansion lay,
A refuge to the neighbouring poor
And strangers led astray.

۱۰

اک کبلی بن میں پتے پر
تھا جھوپڑا جوگی کا
جو دکھیاروں کا تھا سکھ گھر
تھی بھٹکوں کی مٹھیا،

11

No stores beneath its humble thatch
Requir'd a master's care;
The wicket opening with a latch,
Receiv'd the harmless pair.

12

And now when busy crowds retire
To take their evening rest,
The hermit trimm'd his little fire,
And cheer'd his pensive guest;

13

And spread his vegetable store,
And gayly prest and smil'd,
And skill'd in legendary lore,
The lingering hours beguil'd.

14

Around in sympathetic mirth
Its tricks the kitten tries,
The cricket chirrups in the hearth;
The crackling faggot flies.

15

But nothing could a charm impart
To sooth the stranger's woe;
For grief was heavy at his heart,
And tears began to flow.

۱۱

نا ناج کا واں کوئی ڈھیر ہی تھا
ناپو کسی کرتا کوئی
جب جوگی کا وہ دوار کھلا
تو ٹٹی لینے بڑھی

۱۲

اس جوگی نے اٹھ کے لکڑیوں کو
سلگایا آگ جلا کے
آنند بٹوہی جانے لگا ہو
سب دکھ کے بیڑا دیے

۱۳

دیئے ساگ اور پات اس نے پھیلا
پھر ہنس ہنسکر وہ کھلائے
گن ہر کے گا اور گن دکھلائے
پھر کٹھن گھڑی وہ گنوائے

۱۴

کچھ ہنس مکھ بلی کے بچے
واں اچھلے کودے آئیں
کریں چولہے پر جھینگر چرچے
اور چیونٹیاں سر اٹھائیں

۱۵

پر کسی جتن سے بدیسی کا
بہلائے نہ جی بہلے
پچھتاوا تھا جو من میں بھرا
تو آنسو بہہ نکلے

۱ جگیت سنانا ۲ چنچل ۳ لکٹیاں (جلانے لکڑیاں)

16

His rising cares the hermit spy'd;
With answering care opprest:
And whence, unhappy youth, he cry'd
"The sorrows of thy breast?

17

"From better habitations spurn'd,
Reluctant dost thou ro[illegible]
Or grieve for friendship unreturn'd,
Or unregarded love?

18

"Alas! the joys that fortune brings
Are trifling, and decay;
And those who prize the paltry things,
More trifling still than they.

19

"And what is friendship but a name,
A charm that lulls to sleep;
A shade that follows wealth or fame,
But leaves the wretch to weep?

20

"And love is still an emptier sound,
The modern fair one's jest,
On earth unseen, or only found,
To warm the turtle's nest.

۱۶

یہ بالک کو دیکھی جوگی نے
تو سوچ میں گھبرا کے
یوں پوچھا روتے بھر دے
"کیوں روتا ہے پیارے سے؟

۱۷

کس اچھے گھر سے چھوٹا ہے
کیا گئی ہے تجھ پر بیت
کس اونچے بیت کا مارا ہے
کس تریا کی ہے پیت؟

۱۸

دھن کا کیا کوئی سوچ کرے
دھن ہے یہ چنچل چھاؤں
جو مورکھ دھن پر دھیان دھرے،
مت لے تو اس کا ناؤں

۱۹

یاں دکھ میں کون سنگھاتی ہے
ہے بیت کہانی ایک،
سکھ سمپت کا جگ ساتھی ہے
دے ہری کو دکھ میں پھینک

۲۰

اور پیت ہے اس سے بھی بڑھکر
ہے تریا کا یہ کھیل
ہاں رکھتے ہیں اس دھرتی پہ
کچھ چکوا چکوے ہی میل

21

"For shame, fond youth, thy sorrows hush,
And spurn the sex," he said:
But, while he spoke, a rising blush
His love-lorn guest betray'd.

22

Surpriz'd he sees new beauties rise
Swift mantling to the view,
Like colours O'er the morning skies,
As bright, as transient too.

23

The bashful look, the rising breast,
Alternate spread alarms.
The lovely stranger stands confest
A maid in all her charms.

24

And" ah, forgive a stranger rude,
A wretch forlorn," she cry'd,
"Whose feet unhallowed thus intrude
Where heaven and you reside.

25

"But let a maid thy pity share,
Whom love has taught to stray;
Who seeks for rest, but finds despair
Companion of her way.

۲۱

اس سوچ کو چھوڑ اور لاج تج کر
اور تریا سے منہ موڑ"
یہ اس نے کہا پھر دونے اُدھر
دیا جھینپ کے بھانڈا آ چھوڑ،

۲۲

جوگی جب نے دیکھے اچنبھے سے
وہ روپ انوکھے ابھرے رو کے
جوں رات کے جاتے ہی سورج کے
پھر دیس پڑا کرتے

۲۳

تھے لاج بھرے وہ نین اس کے
اور جوبن ابھرا ہوا
دیا بھانڈا پھوڑ ان دونوں نے
اس بھیس میں ہے تریا،

۲۴

تب کہنے لگی دے جی سے مٹا
جو مجھ سے ہوئی ہو بھول،
کیا کام یہاں مجھ پاپن کا
جہاں کھولیں دھرم کے پھول

۲۵

کر اپنی دیا مجھ تریا پر
ہے بپت میں چھوٹا دیس،
یاں چین کہاں اور آس کدھر
ہے بپتا میں یہ بھیس،

26

"My father liv'd beside the Tyne,
A wealthy lord was he;
And all his wealth was mark'd as mine,
He had but only me.

27

"To win me from his tender arms,
Unnumber'd suitors came;
Who prais'd me for imputed charms,
And felt or feign'd a flame.

28

"Each hour a mercenary crowd
With richest proffers strove:
Amongst the rest young edwin bow'd,
But never talk'd of love.

29

"In humble simplest habit clad,
No wealth nor power had he;
Wisdom and worth were all he had,
But these were all to me.

30

"And when, beside me in the dale,
He caroll'd lays of love,
His breath lent fragrance to the gale,
And music to the grove.

۲۶

جمنا کے تیر تھا باپ مرا
سکھ سمپت و بیچ مگن
اور مجھ اکلوتی بیٹی کا
تھا جو بھی اس کا دھن

۲۷

ہیں موہ مجھے۔ اتنے کے لیے
واں سینکڑوں بھر د آئے
رہے جی ہر کوئی مجھ پر دے
ہر کوئی میرا گن گاتے

۲۸

تھی بھیڑ اک چاہنے والوں کی
ہر کوئی لالچ دے
تھا ان میں پیارا موہن بھی
جو پیت کا ناوں نہ لے

۲۹

تھے کپڑے بھی کچھ یوں ہی سے
بل بوتا اور نہ دھن
گن گیان ہی تھا کچھ پاس اس کے
تھا اپنا وہی سجن،

۳۰

جب بیٹھ وہ میرے پاس کبھی
تھا گاتا پیت کے گیت،
جوئے تھی اس کی رس کی بھری
جو دُھن بھی تھی اس کی پیت

31

" The blossom opening to the day,
The dews of heaven refin'd,
Could nought of purity display
To emulate his mind,

32

" The dew, the blossom on the tree,
With charms inconstant shine;
Their charms were his, but woe to me,
Their constancy was mine.

33

" For still I try'd each fickle art,
Importunate and vain;
and while his passion touch'd my heart
I triumph'd in his pain.

34

" Till quite dejected with my scorn,
He left me to my pride;
And sought a solitude forlorn,
In secret where he died.

35

" But mine the sorrow, mine the fault,
And well my life shall pay,
I'll seek the solitude he sought,
And stretch me where he lay.

۳۱

تھیں لاج سے کلیاں مرجھائی
کہیں ڈوب مرے نہ اوس
ان سے وہ من کی ستھرائی
تھی آگے سیکڑوں کوس

۳۲

جوں (بن کی) بوندیں اور کلیاں
ہیں سدا لبھاتی (بن)
وہ میرے جی کو لبھاتا واں
یاں دُھن تھی دُکھائی کی

۳۳

تھی دیکھتی تیکھی چتون سے
اور روٹھتی رہتی پل پل،
تھے ڈھنگ ستانے کے سارے
وہ جاتے ہر پل بل،

۳۴

میں اس پر بھی منتی تھی کہاں
سب توڑ دی اس کی آس
بھایا اس کو جنگل کا ستھان
جہاں جی سے گیا وہ اداس

۳۵

کیا بیٹھے بٹھاتے پاپ چڑھا
کب بھولے گا یہ سوگ
جل جاؤں اس کی چتا پر جا
اس کا دن لیا ہے جوگ

36

"And there forlorn despairing hid,
I'll lay me down and die:
'Twas so for me that Edwin did,
And so for him will I."

37

"Forbid it, heaven! "the hermit cry'd'
And clasp'd her to his breast:
The wondering fair one turn'd to chide
"Twas Edwin's self that prest.

38

"Turn, Angelina, ever dear,
My charmer, turn to see,
Thy own, thy long-lost Edwin here,
Restor'd to love and thee.

39

"Thus let me hold thee to my heart,
And ev'ry care resign:
And shall we never, never part,
My Life,-my all that's mine.

40

"No, never, from this hour to part,
We'll live and love so true;
The sigh that rends thy constant heart,
Shall break thy Edwin's too."

۳۶

پچھتاتی ہار اس بن میں جب
میں دوں گی اپنا جی،
جو بھی آپ موہن نے کیتا
ایسا ہی کروں میں بھی"

۳۷

"اور ایسا مت کہہ" جوگی نے کہا
چھاتی سے اس کو لگا،
مانا ناری نے جی میں بُرا
پر دیکھے تو وہ موہن تھا

۳۸

"اے سندر پیاری دیکھ ادھر
بلہاری تیرے نینوں کے
دیکھ اپنے موہن کو جی بھر کر
جو آن ملا ہے تجھ سے،

۳۹

چھاتی سے تجھ کو لگائے رکھوں،
اور سوچ کر ماروں لات
تو جی ہے۔ تجھ سے الگ نہ رہوں
اور چین کروں دن رات،

۴۰

رکھیں گے پیار سے کام سدا
اب الگ نہ رہوں گے کبھی،
کیا کام اب ٹھنڈی سانسوں کا
آ مل لیں کھول کے جی"

یاں تک کہتے بچن اس جوگی کے
ملا دھن جو گیا تھا، پھن،
جوں ہر نے ان کے دن پھیرے
یوں ہی پھیرے سب کے دن

شہباز یہ گیت انگریزی تھا،
ہندی میں گایا میں،،
اب نیاو کریں اس گانے کا
جو سننے والے ہیں

نگار کا خصوصی سالنامہ

ہندی شاعری نمبر

جسمیں ہندی شاعری کی مکمل تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بسیط تذکرہ موجود ہے۔ اس میں تمام ہندی شعراء کے کلام کا انتخاب ترجمے کے ساتھ درج ہے۔ ساتھ ہی ہندی کے تمام اصناف شعری، ان کے موضوعات اور مباحث اور ساتھ ہی اردو شاعری سے تقابل و تبصرہ پر سیر حاصل مقالات ہیں۔

ہندی کی اصلی قدر و قیمت معلوم کرنی ہو تو
اردو میں صرف یہی ایک مجموعہ ہے

قیمت:۔ چار روپے

شائقینِ ادب کے لیے یہ خاص نمبر ازبس ضروری ہے،

ملنے کا پتہ:۔ نگار پاکستان ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

جنابِ حسینؓ کا قاتل کون تھا؟

(ابن زیاد یا خود اہلِ کوفہ؟)

نیاز فتحپوری

مولانا تمنا عمادی نے "شہادت حسینؓ" کے سلسلہ میں اس وقت تک جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس کا لب لباب یہ ہے کہ حسین کو نہ ابن زیاد نے قتل کیا نہ ابن سعد نے اور نہ یزید کے کسی فوجی نے بلکہ انھیں قتل کیا خود انھیں ساٹھ کوفیوں نے جو حضرت حسین کو اپنے ساتھ کوفہ تک لائے تھے، کیونکہ جب حسینؓ یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو کوفیوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر حسین نے یزید کی بیعت کرلی تو پھر ان کی زندگی کی خیر نہیں۔ ابن زیاد انھیں ضرور قتل کرا دے گا اس لیے انھوں نے خود ہی حسین کو قتل کردیا۔ تاکہ نہ وہ بیعت کرسکیں نہ وہ کوفیوں کے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو۔

اگر مولانا تمنا یہ فرماتے کہ ان کوفیوں نے محض جذبۂ دینی کی بنا پر حسین کو غدار سمجھکر قتل کر دیا اور اپنی جان تک کی پروا نہ کی، تو خیر ایک بات بھی تھی (کیونکہ وہ بیعت یزید پر راضی ہوگئے تھے) لیکن یہ کہنا کہ انھوں نے محض اپنی جان بچانے کے لیے یہ حرکت کی مشکل ہی سے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ میں نے مولانا کو ایک خط بھیجکر مکرر اس واقعہ کی تصریح چاہی تو انھوں نے تحریر فرمایا کہ:-

"یہ ضروری نہیں کہ سب کے سب شریک قتل یا مشورۂ قتل رہے ہوں، بعض ان میں مخلص بھی ہوں گے، بعض منافق بھی، پھر حضرت حسین کے آمادۂ بیعت ہونے سے رنجیدہ تو سب ہوئے ہوں گے اور سب کو اپنی جان کے لالے پڑگئے ہونگے لیکن ہو سکتا ہے کہ بعض نے حضرت حسین کے قتل سے اختلاف بھی کیا ہو۔ اور ان منافقین نے (جو قتل کے مؤید تھے) رات کے وقت خیمہ پر حملہ کردیا ہو اور حضرت حسین اور ان کے عزیزوں کو جو سامنے آیا اسے قتل کردیا ہو۔ پھر شور و غل سُن کر محافظ فوج نے ابن زیاد کی طرف سے ان کوفیوں کا خاتمہ کیا۔ اور اس حملہ میں ان منافقین کے ساتھ وہ مخلصین بیچارے بھی مارے گیے جو حضرت حسین اور ان کے عزیزوں کو بچانے کے لیے خیمہ کے پاس آگئے تھے۔"

مولانا کے اس خط سے یہ بات اور زیادہ موثق ہوگئی کہ انھوں نے قتلِ حسین کا سبب کوفیوں کے صرف اس خوف کو قرار دیا ہے کہ اگر حسین نے یزید کی بیعت کرلی جس پر (بقول مولانا) حسین آمادہ ہوگئے تھے، تو پھر ابن زیاد ان کوفیوں کو زندہ نہ چھوڑے گا جو حسین کو ورغلا کر یہاں لائے تھے، اس لیے انھوں نے یہی سمجھا کہ حسین ہی کو قتل کر دیا جائے۔

چونکہ مولانا نے اپنے اس بیان کی تصدیق میں کوئی تاریخی سند پیش نہیں کی بلکہ صرف قیاس سے کام لے کر یہ حکم لگایا ہے اس لیے اس قیاس پر از روئے عقل و درایت غور کرنے کا حق ہر شخص کو پہنچتا ہے۔

اس بحث میں دو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، ایک یہ کہ جناب حسین بیعت یزید پر آمادہ ہوگئے تھے، دوسرے یہ کہ کوفیوں نے اپنی جان کے خوف سے انھیں قتل کر دیا۔ افسوس ہے کہ مولانا نے ان دو باتوں میں سے کسی بات کا کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ محض قیاس سے کام لے کر ایسا فرمایا ہے۔

کتب تاریخ سے یہ بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ جب حضرت حسین کربلا پہنچے اور انھیں معلوم ہوگیا کہ اہلِ کوفہ سب کے سب ان سے منحرف ہوگئے ہیں تو انھوں نے سمجھ لیا کہ اس صورت میں افواج یزید سے مقابلہ کرنا جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے اس لیے انھوں نے دانشمندی سے کام لے کر تین صورتیں عمر بن سعد کے سامنے پیش کیں (جو ابن زیاد کی طرف سے اس کام پر مامور ہوا تھا) ایک یہ کہ بغیر کسی مزاحمت کے انھیں مکہ واپس جانے دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ انھیں کسی ایسے محاذ پر بھیج دیا جائے، جہاں اسلامی افواج کفار کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ یا پھر یہ کہ انھیں یزید کے پاس شام بھیج دیا جائے" (پھر جو کچھ ہونا ہوگا وہیں ہو جائے گا)

عمر بن سعد نے اس کی اطلاع ابن زیاد کو دی۔ ابن زیاد نے کہا یہ شرطیں کچھ نہیں ہیں۔ ہماری شرط صرف ایک ہی ہے یعنی یہ کہ حسین بیعت یزید پر آمادہ ہو جائیں اور شمر بن ذی الجوشن کے ذریعہ سے اس کی اطلاع عمر بن سعد کو دیدی۔ اسی کے ساتھ ابن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن کو زبانی یہ ہدایت بھی کر دی کہ میرا خط عمر بن سعد کو خود پڑھ کر سنانا، اگر وہ اس کی تعمیل پر راضی ہو جائے تو خیر ورنہ تم اسے قتل کر کے فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لے لینا۔

ہو سکتا ہے کہ عمر بن سعد دل سے یہی چاہتا ہو کہ حسین سے جنگ نہ کرے اور بغیر کشت و خون کے بات آسانی سے طے ہو جائے لیکن ابن زیاد کے اس قطعی حکم کے سامنے وہ مجبور ہوگیا اور جناب حسین سے کہا کہ صلح کی شرط صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ آپ یزید کی خلافت کو مان لیں اور بیعت کرلیں۔

یہ سن کر جناب حسین نے کہا کہ " مجھے موت قبول ہے۔ لیکن بیعت یزید قبول نہیں " اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

یہ ہے بیان قریب قریب تمام مورخین کا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسین کے سامنے بیعت یزید کی شرط تو یقیناً پیش کی گئی تھی لیکن آپ نے اسے سختی سے رد کر دیا۔

اب روایات سے ہٹ کر محض از روئے عقل و درایت اس مسئلہ پر غور کیجیے تو بھی نتیجہ یہی نکلے گا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ جب اول اول امیر معاویہ کی وفات کے بعد جانشینی یزید کا سوال سامنے آیا تو عبداللہ بن عمر نے تو بیعت کرلی تھی لیکن حسینؓ اور عبداللہ بن زبیر اس سے انکار کر کے مکہ چلے آئے اور یہیں انھوں نے اقامت اختیار کرلی۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ یزید کی خلافت کا جھگڑا ابھی ختم ہوگیا تھا۔ بہت سے اشراف قبائل اب بھی یزید کے خلاف تھے اور جن لوگوں کو واقعی خلافت کا اہل سمجھا

جاتا تھا، ان میں ایک ہستی جناب حسینؓ کی بھی تھی اور بڑی اہم ہستی تھی۔ الغرض یزید کے خلاف عام شورش کافی موجود تھی اور خصوصیت کے ساتھ اہلِ کوفہ جو حسینؓ کی طرف مائل تھے۔ اس میں زیادہ نمایاں حصہ لے رہے تھے۔ جب حسینؓ کو اس کا علم ہوا اور مسلم بن عقیل کم و بیش یہاں کے اٹھارہ ہزار نفوس سے حسینؓ کے حق میں غائبانہ بیعت بھی لے چکے تو حسینؓ نے کوفہ جانے کا عزم کر لیا۔ لوگوں نے جن میں ابن عباس اور عبداللہ ابن جعفر بھی شامل تھے آپ سے کہا بھی کہ اہل کوفہ قابل اعتماد نہیں اور ابن زیاد بڑا سخت گیر شخص ہے۔ اس لیے عزم سفر ملتوی کر دینا مناسب ہوگا۔ لیکن آپ نہیں مانے اور تمام افراد خاندان کو لے کر کوفہ کی طرف چل پڑے۔ اس کے بعد راستہ میں اور بہت سے اعرابی بھی آپ کے ہمرکاب ہوتے گئے۔ جب آپ کوفہ کے قریب پہونچے تو ابن زیاد نے حُر بن یزید کو ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ مامور کیا کہ وہ قافلۂ حسینی کو چاروں طرف سے گھیر لے۔ لیکن ابھی اس پر پوری طرح عمل بھی نہ ہوا تھا کہ تمام اعراب نے یہ دیکھ کر کہ یہاں تو معاملہ جنگ و قتال کا ہے۔ نکل بھاگے۔ صرف آپ اور ۷۲ افراد آپ کے خاندان کے رہ گئے جن کو یزیدی فوج نے گھیر لیا۔ کوفہ والے پہلے ہی منحرف ہو چکے تھے۔ مسلم بھی قتل ہو گئے تھے۔ اس لیے آپ نے سمجھ لیا کہ اب سوال جنگ و قتال کا تو ہے نہیں۔ اور یقینی ہلاکت سے بچنے کے لیے آپ نے وہ تین شرطیں پیش کیں، جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ جب ابن زیاد نے ان شرطوں کو رد کر دیا اور کہا کہ چھٹکارے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ یزید کی خلافت تسلیم کر کے اس کی بیعت کر لی جائے۔ یہاں تک جو کچھ میں نے عرض کیا اس میں صرف دو باتوں سے مولانا تمنا کو اختلاف ہے۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک علاوہ افراد خاندان حسینؓ کے اہل کوفہ کے بھی متعدد افراد ان کے ساتھ محصور ہو گئے تھے اور دوسرے یہ کہ جب ابن زیاد کی طرف سے بیعت کی شرط پیش کی گئی اور حسینؓ اس پر راضی ہو گئے تو ان کوفیوں نے اس خیال سے کہ بیعت یزید کے بعد ابن زیاد ان کو نہ چھوڑے گا۔ بیعت کی کارروائی سے پہلے ہی حسینؓ کو قتل کر دیا۔ لیکن یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہیں آتی کہ کیا کوفی اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اگر انھوں نے حسینؓ کو قتل کر دیا تو وہ اور زیادہ خطرہ میں پڑ جائیں گے کیونکہ اول تو بات ایسی نہ تھی جو چھپ سکتی اور ابن زیاد اس سے بے خبر رہتا دوسرے یہ کہ کوفی (اگر وہ واقعی حسینؓ کے کیمپ میں موجود تھے) خود بھی محصور رہے ہوں گے اور حسینؓ کو قتل کرنے کے بعد بچ نکلنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ مولانا تمنا کا خیال ہے کہ یہ واقعہ رات کا ہے اور اس کی نوعیت گویا شبخون کی سی تھی اگر یہ بات صحیح ہو تو بھی کوفیوں کو سمجھنا چاہیے تھا کہ حسینؓ کے خیمہ میں ان کے اور اعزہ بھی موجود ہونگے اور وہ ضرور مزاحمت کریں گے۔ اس لیے خاموشی کے ساتھ حسینؓ کو قتل کر کے بھاگنا ممکن نہ ہوگا خاصکر ایسی صورت میں کہ یزیدی فوج بھی خیمہ حسینؓ کے چاروں طرف موجود ہے۔

اس لیے مولانا تمنا کا یہ قیاس کہ کوفیوں نے محض اپنی جان بچانے کے لیے حسینؓ کو قتل کیا میری سمجھ سے بالکل باہر ہے کیونکہ کوئی اسقدر احمق نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ حسینؓ کو قتل کر کے اور زیادہ سخت خطرہ مول لیتے۔ بیعت یزید کے بعد تو اس کا امکان تھا کہ ہاتھ پاؤں جوڑ کر یا کوئی بہانہ تراش کر اپنی جان بچا لیتے۔ لیکن حسینؓ کو قتل کرنے کے بعد تو کوئی صورت ان کے مفر کی باقی ہی نہیں رہ سکتی تھی اور وہ ایسے بیوقوف نہ تھے کہ اس بات کو نہ سمجھ سکتے۔ اس لیے مولانا تمنا کا یہ ارشاد کہ کوفیوں نے محض اپنی جان بچانے کے لیے حسینؓ کو قتل کیا۔ بالکل میری سمجھ سے باہر ہے۔ ہاں اگر وہ یہ کہتے کہ کوفیوں نے حسینؓ کو غدار سمجھ کر قتل کر دیا تو خیر یہ بات کچھ بن جاتی گو اس صورت میں بھی حسینؓ کی رضامندی بیعت کا ثبوت مولانا تمنا ہی کے سر رہتا جس کو وہ کسی تاریخ سے توثیق نہ کر سکتے اور صرف قیاس ہی سے کام لیکر کہہ سکتے تھے کہ حسینؓ نے بیعت یزید پر رضامندی ظاہر کر دی تھی جو حسینؓ کے بلند کردار کو دیکھتے ہوئے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ بعض تاریخوں میں مثلاً خمیس میں لکھا ہے کہ "ان اضع یدی فی یدہ" لیکن

...روئے محاورہ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں بیعت کر لوں گا بلکہ صرف یہ کہ میں خود اس سے بالمشافہ گفتگو کروں گا۔ حسینؑ کا موقف ...روع ہی سے یزید کے خلاف بہت سخت تھا اور انھوں نے کبھی اس کو مستحق خلافت نہیں سمجھا۔ اس لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ ...کوفہ پہنچنے کے بعد محض اپنی جان بچانے کے لئے یزید کی بیعت پر راضی ہو جاتے۔

ایسی صورتوں میں تو ایک معمولی شخص بھی اپنی غیرت و خودداری پر جان دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ حسینؑ ...کو علیؑ جیسے مرد دلیر کے بیٹے اور محمدؐ جیسے غیر معمولی عزم و ثبات رکھنے والے صداقت پسند انسان کے نواسہ ہونے کا فخر ...صل تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ مولانا نے اس باب میں صرف کوفیوں کے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے اور وہ خود اس کے قائل نہیں کہ ...سینؑ بیعت یزید پر راضی ہو گئے تھے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ واقعی حسینؑ، بیعت یزید پر آمادہ ہو گئے ...تو پھر یہ بڑی عجیب و غریب بات ہوگی، کیونکہ اموی مورخین نے بھی یزید کے سر سے قتل حسینؑ کا الزام دور کرنے کے لیے کہیں اس ...ذکر نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں ڈیڑھ ہزار سال قبل کے واقعات کا صحیح علم بہت دشوار ہے۔ خاصکر اس صورت میں کہ مورخین ...ہ بخیر، جان بوجھ کر مسخ بھی کر دیا ہو، تاہم قیاس و درایت کا تعلق محض ذہنی اپج سے بھی تو نہیں۔ اور اگر یہ رسم عام ہو گئی تو ...سکتا ہے کہ کل اس مسئلہ خاص میں کوئی شخص ایک تیسری صورت یہ پیش کرے کہ حسینؑ کو نہ یزیدی فوج نے قتل کیا نہ کوفیوں نے ...بلکہ خود انھوں نے اپنے آپ کو ہلاک کیا اور ان کے اتباع میں قافلۂ حسینیؑ کے اکثر افراد نے بھی خودکشی کر لی تھی۔

اہم سرکاری مطبوعات

۱۔ کتابچہ محصول جائداد ذاتی ــــــــ ۳ روپے ۲۵ پیسے
۲۔ کتابچہ قانون و قواعد بندوبست ــــــــ ۱۴ روپے ۲۵ پیسے
۳۔ دستاویزات دستور اساسی ــــــــ جلد ۴ ۔ ب ۔ ۳۲ روپے ۶۲ پیسے
۴۔ دستاویزات دستور اساسی ــــــــ جلد ۴ ۔ الف ۔ ۳۰ روپے ۶۲ پیسے
۵۔ اردو ترجمہ رپورٹ غذائی و زراعتی کمیشن ــــــــ ۵ روپے ۷۵ پیسے
۶۔ خاکہ تیسری پنجسالہ منصوبہ بندی ــــــــ ۳ روپے

ان جگہوں سے حاصل کیجئے:۔

۱۔ منیجر آف پبلیکیشن، حکومت پاکستان، بلاک نمبر ۴۴ شاہراہ عراق۔ کراچی۔
۲۔ مغربی پاکستان کے تمام مقررہ ایجنٹ۔

تجلی المجلی

(ارضِ ہند کا ایک پاکستانی عالم ترکستان میں)

م۔ روحی اولغور کاشغری

وسطی ایشیا سے متعلق ہو یا ایشیائے کوچک سے۔ ترکوں نے اسلامی علوم اور فارسی و عربی ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان سے انکار ممکن نہیں اور اس سلسلہ میں جن ترک علماء۔ شعراء اور ادباء نے نام پیدا کیا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ حتی کہ اردو ادب بھی ترکوں کی خدمات اور اثرات سے بے بہرہ نہیں رہا۔ سب سے پہلے ترکوں ہی نے اس زبان کو ترکی نام سے سجایا اور بہت سے ترکی کلمات سے مزین کیا وہ نامور شعراء اور ادبا جنہوں نے اردو زبان کو ترقی کے مدارج پر پہنچایا ان میں غالب۔ بہادر شاہ ظفر۔ رجب علی بیگ سرور۔ میرزا عظیم بیگ چغتائی اور عصمت چغتائی وغیرہ جو ترک نژاد ہیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دسویں صدی میں برصغیر ہند۔ پاک میں غزنویوں کی آمد اور اس کے بعد دہلی میں ترکوں کی سلطنت کے قیام کی برکت سے فارسی زبان کے ماہر ترک اور غیر ترک ادباء علماء و شعراء وسطی ایشیا، ایران اور خراسان سے آنے لگے اور ان کی لائی ہوئی فارسی زبان سے کھڑی بولی یا ہندی زبان کی آمیزش کی وجہ سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جس کا موجودہ نام ترکی لفظ اردو ہے۔ اور یہ زبان برصغیر ہند۔ پاکستان میں کسی خاص قوم کی نہیں، بلکہ ایک عام بولی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندو۔ سندھی۔ پٹھان۔ بلوچ۔ پنجابی۔ بنگالی۔ دہلی والے۔ لکھنؤ والے اور اس وسیع ملک کے کسی بھی کونے میں رہنے والا کیوں نہ ہو ان سب کے درمیان ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے کا واحد ذریعہ یہی اردو زبان ہے۔

مگر حیرت کا مقام ہے کہ ترکوں کی فارسی۔ عربی اور اردو ادب کی ان تمام خدمات کے باوجود ہمیں تاریخ میں ایسی ایک مثال نہیں ملتی ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والوں میں سے کوئی ایسا عالم شاعر اور ادیب وجود میں آیا ہو جس نے اپنے محسن ترکوں کے ادب و ثقافت کی طرف بھی اعتنا کیا ہو۔

ترکوں کے نامور کلاسیکی شاعر امیر علی شیر نوائی کے کہنے کے مطابق صورت حال ہمیشہ یہ رہی ہے کہ ترکوں نے اپنی زبان کو زندہ رکھنے کے علاوہ فارسی اور عربی ادب کی بھی خدمت کی اور ان زبانوں کو بھی زندہ رکھا۔

لیکن ان زبانوں کے بولنے والوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں نکلا۔ جس نے ترکی زبان سیکھی ہو اور اس زبان میں کوئی شعر کہا ہو یا کوئی کتاب لکھی ہو۔ امیر علی شیر نوائی اپنی کتاب "محاکمۃ اللغتین" میں جسے اس نے ترکی زبان کی فارسی

زبان پر برتری ثابت کرنے کی غرض سے لکھا ہے۔ کہتا ہے :۔ ترک لوگ ہمیشہ فارسی اور دوسری زبانوں کو نہایت آسانی سے سیکھ سکتے ہیں اور اس میں شعر کہہ سکتے۔ کتابیں لکھ سکتے ہیں لیکن اس کے برعکس ایک فارسی بولنے والا ترکی زبان کو آسانی سے سیکھ اور بول نہیں سکتا۔ شعر کہنا تو بڑی بات ہے۔

یہ حقیقت ہے اور تاریخ بھی امیر علی شیر نوائی کی اس حقیقت پر مبنی دعویٰ کو جھٹلا نہیں سکتی۔

ان حالات کے تحت قارئین کو یہ پڑھ کر بڑی حیرت ہوگی کہ اس برصغیر ہند۔ پاک کا رہنے والا ایک عالم اور ادیب ایسا بھی تھا جس نے ترکستان کے ایک دور کونے میں بیٹھ کر ترکی ادب کی عظیم خدمت انجام دی جس کا نام آج تک شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔

اس عالم کا پورا نام راقم الحروف کو معلوم نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ مشرقی ترکستان میں تجلی المجلی کے تخلص سے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ آیا تجلی المجلی خود یہاں سے ترکستان جا کر آباد ہو گیا تھا یا اس کے آباؤ اجداد وہاں گئے تھے۔ بہرحال یہ شخص انیسویں صدی کے اواخر میں مشرقی پاکستان کی ادبی تاریخ میں ایک بڑے عالم اور ترکی زبان کے ایک بڑے شاعر کی حیثیت رکھتا ہے جو حکیم حاذق بھی تھا۔ وہ یارقند اور ختن کے درمیان قادر غالیق نام کے ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتا تھا اور وہیں اس نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ اپنی ترکی ادب کی خدمات اور خاص کر اپنے ترکی دیوان کی وجہ سے نیز درس و تدریس اور علمی اور طبی خدمات کی وجہ سے ترکستان بھر میں اچھی خاصی شہرت رکھتا تھا۔ اس کے دو دیوان، ایک غزلیات کا اور دوسرا شاید قصاید کا کاشغر کے نزدیک قصبہ ینی حصار کے کسی چھاپہ خانہ میں چند خیر خواہوں کی مدد سے چھپے۔

لیکن وہ ان خدمات اور شہرت کے باوجود ایک گمنام عالم کی حیثیت رکھتا ہے اور یہاں اب اس کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔

ترکستان میں وہ اس لئے گمنام ہے کہ آجکل وہاں کی صورت حال ایسی ہے کہ ایک غیر ملکی خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو۔ اس کی قدر کرنے کے لئے حالات مساعد نہیں ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ وہ وہاں کے علماء جو وہاں کے اصلی باشندے ہیں توجہ سے محروم ہیں تاہم ان نامساعد حالات کے باوجود تجلی المجلی کا نام وہاں کے لوگوں کے دلوں میں اب بھی زندہ ہے اور آیندہ بھی زندہ رہے گا۔

تجلی المجلی یہاں کے مسلمانوں کے اندر اس لئے گمنام رہا ہوگا کہ اس کا دیوان اور شاید دوسری مؤلفات ترکی ہی میں ہیں اور یہاں کے کسی علمی اداروں سے اس کے تعلقات نہ رہے ہوں گے۔ یا شاید فراموش کر دیئے گئے ہوں اگرچہ کہا جاتا ہے ان کے صاحب زادہ لاہور میں رہتے تھے اور وہ خود بھی لاہور کے باشندہ تھے بہرحال یہ امر قابل تحقیق ہے اور اس کی قابل قدر شخصیت گمنامی کے کونے میں نہیں ڈالی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر راقم الحروف پہلی مرتبہ اس گمنام جلیل القدر عالم کا برصغیر ہند۔ پاک کے علمی اور ادبی حلقوں سے تعارف کرانا چاہتا ہے تاکہ اگر کسی کو کچھ اس کے حالات معلوم ہوں تو سامنے آ جائیں۔

میں خود تمام کوششوں کے باوجود ترکی ادب کے اس مایہ ناز ہستی کے حالات معلوم نہ کر سکا۔ نہ یہ کہ وہ اصلاً برصغیر ہند۔ پاک میں کہاں کا باشندہ تھا۔ کس زمانے میں تھا۔ کب پیدا ہوا۔ کب فوت ہوا۔ کہاں تعلیم پائی اور

اس کا پورا نام اور نسب کیا تھا۔

اگر حالات سازگار ہوتے اور اہل ترکستان کو اس طرف توجہ کرنے کا موقع ملتا تو آج وہ ترکستان میں وہی حیثیت و شہرت رکھتا جو غالب کو برصغیر ہند و پاک میں حاصل ہے۔ چونکہ اس نے مشرقی ترکستان میں وہ زمانہ پایا تھا جب وہاں علمی حیثیت سے قحط الرجالی کا دور دورہ تھا۔ نہ کوئی قابل ستائش عالم تھا اور نہ کوئی شاعر و ادیب اس لئے اس کا گمنام رہنا حیرت کی بات نہیں۔

مولانا نیاز فتحپوری کی پانچ کتابیں

(۱) من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ اور اخوت عامہ کے ایک نئے رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔

قیمت:- ۷ روپے ۵۰ پیسے۔

(۲) شہوانیات

جس میں تاریخی، علمی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے انسان کے میلان شہوانی پر ایک بسیط نظر ڈالی گئی ہے

قیمت:- چار روپے ۵۰ پیسے

(۳) فراست الید

اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی ساخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، عروج و زوال، موت و حیات وغیرہ پر پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت:- ایک روپیہ ۲۵ پیسے

(۴) شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔

قیمت:- دو روپے

(۵) امیر معاویہ و یزید

مولانا محمود عباسی کی کتاب "خلافت امیر معاویہ و یزید" پر مولانا نیاز فتحپوری کا عالمانہ و بے لاگ تبصرہ

قیمت:- ۶۲ پیسے

بہت جلد شائع کی جا رہی ہیں

نگار پاکستان - ۳۲ - گارڈن مارکیٹ - کراچی نمبر ۳

بعض غیر معروف فارسی شعراء

نیاز فتحپوری

غزالی مشہد میں پیدا ہوا (سنہ ۹۳۶ھ) اپنی مذہبی آزاد خیالی کی بنا پر جب اہل وطن نے اسے شہر سے نکال دیا تو یہ ہندوستان آیا اور اکبر کے ایک امیر خان زماں (علی قلی خاں) کے دربار سے وابستہ ہو گیا جو اس وقت جونپور کا گورنر تھا۔ جب خان زماں نے بغاوت کی اور اکبر نے اس کی سرکوبی کی تو غزالی دربار اکبری سے وابستہ ہو گیا اور ملک الشعراء کا خطاب حاصل کیا۔ (وفات احمد آباد گجرات سنہ ۹۸۰ھ)

اس کا تخلص غزالی نہیں بلکہ غزالی تھا، (منسوب بہ غزال)۔

اس نے میر حسن دہلوی کی غزلوں کے جواب میں بھی ۲۰ غزلیں لکھیں۔ اس کی تصانیف یہ ہیں (۱) گنج اکبری جو مشتمل ہے اکبر کے مدحیہ قصاید، ایک اخلاقی مثنوی اور مختلف قطعات جن میں ایک قطعہ وہ بھی ہے جو جہانگیر کی ولادت پر اس نے لکھا تھا (۹۷۷) (۲) آثار الشباب دیوان غزلیات جو اس کے عہد شباب کا سرمایہ ہے اور اکبر سے منسوب ہے (۳) اسرار مکتوم مثنوی تصوف (۴) سنت الشعراء، مجموعۂ قصاید جو شاہ طہماسپ خان زماں اور منعم خاں وغیرہ کی مدح میں لکھے گئے۔ (۵) نقش بدیع مثنوی صوفیانہ رنگ کی نظامی کی مخزن اسرار کے جواب میں (۶) ایک مثنوی کسی عالم کی مذمت میں جو غزالی کا مخالف تھا۔ (۷) مثنوی امیر قلیج خاں کی ہجو میں جو غالباً اکبر ہی کے اشارہ سے لکھی گئی تھی

روح الامین تخلص میر جملہ (میر محمد امین) کا جو اصفہان کے ایک سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ سنہ ۱۰۱۱ھ میں دکن آیا اور محمد قلی قطب شاہ فرمانروائے گولکنڈہ کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ اس کے بعد ۱۰۲۷ میں جہانگیر کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور تا وفات ۱۰۴۷ تک مختلف خدمات پر مامور رہا۔ اس کا مجموعۂ منظومات ۲۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ (حسب بیان طاہر نصیر آبادی) نظامی کا بڑا معترف تھا۔ اس کی تصانیف یہ ہیں (۱) مثنوی لیلیٰ و مجنوں جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

اے حسن طراز عشق پرداز

انجام نمائے کار ز آغاز

(۲) آسمان ہشتم مثنوی بجواب ہفت پیکر نظامی۔ آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

اے رواں آفرین دل آرائے

اے خرد را بخویش راہنمائے

دیوان کا نام گلستان ناز تھا اس کا پہلا شعر یہ ہے

اے روشن از فروغ تو شمع رواں ما

از نور قدرت تو چکیدست جان ما

ہاتفی - مولانا عبداللہ۔ ہکوتت خرجرد (سوتہ جام) جامی کا بھانجہ۔ اپنے عہد کا بے مثل مثنوی نگار۔ اس نے خمسہ نظامی کے تتبع میں خود بھی پانچ مثنویاں لکھنے کا ارادہ کیا تھا جو پورا نہ ہو سکا۔ لیلےٰ مجنوں اس کی پہلی مثنوی تھی جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد
توقیع قبول روزیش باد،

دوسری مثنوی "شیریں وخسرو" ہے۔ تیسری ہفت منظر۔ اور چوتھی تیمور نامہ جسے ظفر نامہ ہاتفی بھی کہتے اور جس کی تیاری میں اس نے ۴۰ سال صرف کئے۔

ہفت منظر کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے (یہ نظامی کی ہفت پیکر کے جواب میں لکھی گئی تھی)

اے نگارندۂ صحیفۂ غیب
نام تو صدر صفحۂ لاریب

تیمور نامہ آخری مثنوی جو نظامی کے سکندر نامہ کا جواب ہے، آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

بنام خدائے کہ فکر وخرد
نیارو کہ تا کنہ اوپے برد

اس میں وہ فرمانروائے وقت (سلطان حسین) کی مدح کا آغاز اس طرح کرتا ہے کہ

شہا شہریارا، سراسر درا
خداوندگارا، جہاں پرورا

تیمور نامہ کی بنیاد ظفرنامہ پر قائم ہے جو فتوحات تیموری کی سرکاری دستاویزات سے مرتب ہوا تھا۔

سام مرزا اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ میرا باپ شاہ اسماعیل فتح خراسان کے بعد جب خرجرد سے گزرا (۹۱۷ھ) تو ہاتفی سے ملنے گیا۔ جو عزلت نشین ہو گیا تھا۔ خانہ باغ کا دروازہ بند پایا تو دیوار پھاند کر اندر گیا اور ہاتفی سے ملکر خواہش ظاہر کی کہ وہ فتوحات تیموری کی طرح اس کی فتوحات کو بھی منظوم کردے۔ چنانچہ ہاتفی نے اس کو منظور کرلیا لیکن صرف ایک ہزار اشعار لکھ چکا تھا کہ انتقال کر گیا (۹۲۷ھ)

لیلےٰ مجنوں کے دیباچہ میں اس نے چار فرمانروایان سخن ظاہر کئے ہیں۔ ایک فردوسی، دوسرا انوری، تیسرا سعدی جامی کو اس نے چوتھا درجہ دیا ہے۔

ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ:-

علی شیر خاں۔ محلہ کھترانہ کلاں۔ رائے بریلی۔ یو۔پی

باب المراسلۃ والمناظرہ

عبداللہ بن سبا کا وجود

(پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی)

مکرمی مولانا نیاز ۔ تسلیم !

میرے مقالہ بعنوان عبداللہ بن سبا مطبوعہ نگار ماہ فروری پر مارچ کے شمارے میں آپ نے جو تبصرہ فرمایا ہے اس میں آپ نے حضرت عثمانؓ کے اسباب قتل سے زیادہ بحث کی ہے اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس فعل کا ذمہ دار تنہا عبداللہ بن سبا نہ تھا بلکہ خود حضرت عثمان کی سیاسی و انتظامی بے عنوانیاں، اقربا پروری، اور غیر اموی افراد کے ساتھ بے انصافیاں بھی شامل تھیں ممکن ہے ایسا بھی ہو ۔ اس کا جواب علمائے اہل سنۃ دے چکے ہیں اور دیں گے ۔ مگر معتقدات عجم میں میرا موقف یہ نہیں ۔ میں نے حضرت عثمان کی سیرت سے بحث نہیں کی ۔ میرا موضوع ابن سبا تھا ۔

اس موضوع پر ایک طرف آپ یہ فرماتے ہیں کہ قتل عثمان کا ذمہ دار تنہا ابن سبا نہ تھا، اور عوامل بھی کار فرما تھے ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ شریک تھا ۔ گو میں نے یا کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے حضرت عثمان کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا یا اپنے سامنے قتل کرایا ۔ دوسری طرف آپ یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ عبداللہ ابن سباء کا وجود ہی معرض بحث ہے ۔ "کیونکہ" طبقات ابن سعد میں اس کا ذکر نظر نہیں آتا ۔ مگر سبائیوں اور ان کے عقیدۂ الوہیتِ علیؓ کا ذکر اس میں موجود ہے ۔ پھر ابن سبا کوئی تھا ہی نہیں تو یہ فرقہ سبئیہ کیا ہے ۔ جن کے وجود کو ابن سعد نے تسلیم کیا ہے ؟ آپ فرماتے ہیں کہ " بلاذری نے اپنی تالیف انساب الاشراف میں اس کا نام نہیں لیا "۔ ممکن ہے ابن سبا کے اشرافِ قریش میں نہ ہونے کے سبب سے اسے ترک کیا ہو یا وراق کی دست درازی ہو جو کوئی غیر معمولی بات نہیں ۔ بہر حال اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ مورخوں میں بلاذری کے معاصر طبری متوفی ۳۱۰ھ سے جو خود شیعی تھا اس کا پتہ چلتا ہے اور تمام معتبر و ثقہ مورخین ابن حزم، ابن حجر عسقلانی، ابن عساکر ۔ ابن خلدون ہی نہیں بلکہ اکابر شیعی طاہر بن المطہر البلخی مولف کتاب البدء والتاریخ، خیر الدین زرکلی، النوبختی جو تیسری صدی ہجری کے شیعی علمائے اجلہ میں سے ہیں، مولف رجال کشی، خود حضرات امام باقر و جعفر صادق کی سند سے ابن سبا کے کرتوت بیان کرتے چلے آتے ہیں جن کا ذکر میں نے اپنے مقالہ مذکور میں کیا ہے ۔ ان کے علاوہ الشیخ المامقانی نے اپنی کتاب تنقیح المقال ج ۲، ص ۱۸۳ مطبوعہ نجف اشرف میں ابن سباء کا ذکر " اصحابِ علی " میں کیا ہے ۔ الشیخ الطائفہ ابوجعفر محمد بن حسن الطوسی متوفی ۴۶۰ھ نے اپنی کتاب الرجال ص ۵۱ مطبوعہ نجف اشرف میں، اور عضد الدین عبدالرحمن الایجی نے اپنی کتاب

اشرف التواریخ میں ابن سبا کے حالات بیان کئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام باقر کے زمانے سے ہی غیر شیعی گروہ کا اہلِ تشیع کے خلاف یہ الزام یا اتہام عام ہو چکا تھا کہ اہلِ تشیع نے حضرت علی کی الوہیت، رجعت، وصایت و امامت کے عقائد ابن سبا کی وساطت سے یہود سے اخذ کر لئے ہیں اور اسی لئے امام جعفر صادق نے ابن سبا پر لعنت بھیجی اور تبرّی کی۔

باوجود اتنے شواہد کے جن میں اکابر شیعہ سُنی دونوں ہیں۔ آپ یا آپ کے ماخذ یعنی ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا ایک جنبش قلم سے اس تاریخی شخصیت سے انکار یا اشتباہ کر کے طبری سے لے کر ابن خلدون تک کی تکذیب کرنے کی جراُت کر بیٹھتے ہیں پھر تاریخِ اسلام کے لئے ہمارے پاس کیا مواد رہ جاتے ہیں؟ لطف یہ ہے کہ خود طٰہٰ حسین کو اپنی کتاب الفتنۃ الکبریٰ کے مواد کے لئے چار و ناچار زیادہ تر طبری ہی سے مدد لینا پڑی ہے۔ افتؤمنون ببعض وتکفرون ببعض؟

ان مورخین اسلام کے مقابلے میں آپ فرماتے ہیں کہ "بیروت کے ایک محقق نے اسی موضوع پر ایک رسالہ میں ابن سبا کے وجود کو بالکل وہمی و فرضی چیز قرار دیا ہے۔" آپ کو اس محقق کا نام معلوم ہے نہ کتاب کا۔ العجب ثم العجب! تحقیق علمی کی دنیا میں اس کی کیا قیمت ہو سکتی ہے؟

بیروت کے اس مجہول محقق کے مقابلے میں جدید محققین مصر کی بات آپڑی ہے تو عرض ہے۔ کہ ایک تو علامہ خضری ہیں جن کی تاریخ اسلام کے متعدد ترجمے اُردو میں ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ابن سبا کی قلعی کھولی ہے۔ دوسرے علمائے ازہر میں سے سعد محمد حسن پروفیسر وزارۃ المعارف مصر مولف المهدیۃ فی الاسلام نے ابن سبا کے عقائد و اعمال کا ذکر کیا ہے۔ تیسرے احمد امین مصری اس رتبے کے ہیں کہ خود طٰہٰ حسین ان کو مانتے ہیں۔ احمد امین اپنی تالیفات فجر الاسلام وضحی الاسلام میں نہ صرف ابن سبا کے کرتوتوں پر تاریخی روشنی ڈالتے ہیں۔ احمد امین اپنی تالیفات فجر الاسلام وضحی الاسلام میں نہ صرف ابن سبا کے کرتوتوں پر تاریخی روشنی ڈالتے ہیں بلکہ توضیح کرتے ہیں کہ "بعض محققین (اغلباً طٰہٰ حسین) کا خیال ہے کہ ابن سبا محض ایک فرضی کردار ہے جس کا تاریخی حیثیت سے وجود محقق نہیں مگر ہم نے ان کے دلائل نہیں پائے جو ان کے دعوے کو ثابت کرتے ہوں" (فجر الاسلام باب ۳۔ فصل ۲)

طٰہٰ حسین جو احمد امین کے قلبی دوست ہیں۔ ان کی تصنیفات کے تعارف میں بار بار اقرار کرتے ہیں کہ ان کی ترتیب و تالیف میں ہم اور دوسرے اہل علم احباب ان کے شریک اور متحد الرائے ہیں (مقدمہ فجر الاسلام)۔ وہ اقرار کرتے ہیں کہ "جہاں تک مجھ سے ہو سکا ہے میں نے کوشش کی ہے کہ کسی دوست پر اس کی دوستی کی وجہ سے اور دشمن پر اس کی دشمنی کی وجہ سے حد عدل سے تجاوز نہ کروں۔ میں نے تنقید کرنے میں ہمیشہ اسی اصول کی سختی سے پابندی کی ہے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے پوری کوشش کی کہ مجھے اس کتاب میں کوئی عیب مل جائے تو پیش کروں مگر نہ ملا۔" (مقدمہ ضحی الاسلام) انھوں نے احمد امین کی پوری کتاب سے اپنی ہم خیالی ظاہر کی ہے۔ اس میں واقعات زندگی ابن سبا بھی داخل ہیں جن کا احمد امین نے جا بجا صراحت سے ذکر کیا ہے۔ پھر بھی طٰہٰ حسین نے اپنی الفتنۃ الکبریٰ میں ابن سبا کے وجود کو مشتبہ اور فرضی قرار دیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ طٰہٰ حسین کے نظریات، تاریخی کم اور قیاسی زیادہ ہیں۔ وہ بیان وقائع تاریخی میں اسناد اور حوالے پیش نہیں کیا کرتے۔ تاریخ نویسی میں استقرائی طرز استدلال بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اس طرز کے لئے جیسے محکم وکثیر التعداد

قدماتی قضیے ضروری ہوتے ہیں ان پر دسترس نہیں ہوتا ۔ اکثر مغربی مورخین کا طرز استدلال یہی ہے ۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین
خین کی تقلید میں کمزور استقراء سے قیاسی نتائج اخذ کر لیتے ہیں ۔ وہ اپنے کچھ مزعومات قائم کر لیتے ہیں اور اس کی پروا نہیں
رتے کہ اصحابِ تاریخ و سیر کے اقوال و روایات کیا ہیں ۔ مثلاً وہ یوں کہہ جاتے ہیں " مجھے یقین کی حد تک اعتقاد ہے
حضرت عثمانؓ نے سعد بن ابی وقاص کو بلوا کر انھیں اپنے اور حضرت علی کے مابین سفارت پر آمادہ کیا ہوگا اور یہ شرط
طے پائی ہوگی کہ خلافت کا معاملہ اصحابِ شوریٰ اور ارباب حل و عقد کا سپرد کر دیا جائے (الفتنۃ الکبریٰ آخر باب ۱۹) یا یہ کہ
یرا خیال ہے کہ حضرت ابوذر ہرگز اس امر کے محتاج نہ تھے کہ انہیں ایک نو وارد (ابن سباء) یہ پڑھائے کہ فقراء کے اغنیا پر
بیت سے حقوق ہیں ۔ نیز انھیں بتائے کہ بیت المال مال مسلمین ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " (باب ۱۳) یا یہ کہ معلوم نہیں کہ ابن سباء کو
ہد عثمان میں کوئی وقعت حاصل ہوئی تھی یا نہیں ، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس کی کچھ وقعت ہوئی تھی تو وہ چنداں اہمیت
نہ رکھتی تھی ۔ حضرت عثمان کے عہد کے مسلمان ایسے گئے گزرے نہ تھے کہ اہل کتاب میں سے ایک نو مسلم یہ مقام حاصل
رلے کہ ان کی عقل و فکر اور حکومت تک سے مذاق کرنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی سازشوں کو تمام سلطنت میں نشر کر دے ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ اگر اس نو مسلم فتنہ پرداز کو عبداللہ بن عامر نے پکڑا ہوتا تو حضرت عثمان کی خدمت میں ضرور تحریر کیا ہوتا ، اس
کی سخت گرفت کی گئی ہوتی ۔ اور اگر وہ سعد بن ابی سرح کے ہاتھ لگ جاتا وہ اسے سزا دئے بغیر نہ رہتے (باب ۱۲) ۔
شہادت تاریخی کو ظن و تخمین سے کیا سروکار ؟

اصل یہ ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین ان انشا پردازوں میں سے ہیں جو تاریخ کو فلسفہ ہی نہیں شعر بنا دیتے ہیں ۔ جیسے فارسی
اردو شاعر صرف قافیوں کی خاطر مضامین باندھ لیتے ہیں ۔ حقیقت سے بحث نہیں ہوتی ۔ اسی طرح یہ انشا پرداز مورخ اپنی
چرب زبانی سے اپنے پسندیدہ خیالات کے مطابق واقعات کو ان کے سانچوں میں ڈھال لیتا یا توڑ مروڑ لیتا ہے ۔ اسے
حضرت علیؓ سے فرط محبت اور حضرت عثمانؓ سے نفرت ہے وہ حضرت عمر کے بعد صرف حضرت علی کو مستحق خلافت
اور عثمان کو قطعاً نا اہل سمجھتا ہے ۔ ایسی رائے قائم کر لینے کا اس کو اختیار ہے مگر اس رائے کی تائید میں تاریخی شہادتوں
کے علی الرغم قیاس آرائیوں اور مضمون آفرینیوں یا اخفائے حقیقت کا حق نہیں پہنچتا ۔

بہر حال جیسا کہ میں عرض کر چکا استحقاق خلافت کا مسئلہ سر دست میرا موضوع نہیں اس لئے اس سے صرف نظر
کرتا ہوں ۔

آپ سے التجا ہے کہ تاریخ پر رحم فرما کر اسے ظن ، تخمینی و قیاس آرائی سے علیحدہ رکھئے ۔ شاید کچھ لوگ اس روش سے
خوش ہو جائیں مگر تاریخ کسی کو معاف نہیں کرتی ۔ جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا ۔

(نگار) میں نے صرف یہ ظاہر کیا تھا کہ قتل عثمانؓ کے باب عبداللہ بن سباء کو اتنی اہمیت دینا کہ اس المیہ
کا ذمہ دار تنہا اسی کو قرار دیا جائے ، درست نہیں اور اسی لئے میں نے شہادت حضرت عثمان کے سلسلہ میں ان اسباب کا بھی ذکر کرنا
ضروری سمجھا جو میرے نزدیک اس المناک حادثہ کا باعث ہوئے ۔ ہو سکتا ہے کہ عبداللہ بن سبا کوئی فرضی ہستی نہ ہو اور وہ
حضرات جو اس کے وجود کے قائل نہیں ہیں غلطی پر ہوں ! لیکن باوجود ان تمام تاریخی شہادتوں کے جن کا حوالہ آپ نے دیا ہے
ہر شخص کو یہ حق باقی رہتا ہے کہ وہ تاریخ کی کتابوں کو بھی ناقدانہ نظر سے دیکھے ، علی الخصوص اس صورت میں جب کہ ان میں

سے کوئی کتاب ایسی نہیں جس کا مصنف امویین و علویین کے سیاسی پروپاگنڈا سے متاثر نہ ہوا ہو اور اپنے ممدوحین کے خوش کرنے کے لئے اس نے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کے لئے روایات کا ڈھیر نہ لگا دیا ہو۔ بہرحال عبداللہ بن سبا رہا ہو یا نہ رہا ہو اس کی حیثیت اس بساط پر ایک نہایت معمولی مہرہ کی سی تھی اور اسے اتنی اہمیت دینا کہ جب قتل حضرت عثمان کا ذکر آئے تو اس کا آغاز اسی نومسلم یہودی کے نام سے کیا جائے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ڈاکٹر طہٰ حسین کے متعلق آپ کا ارشاد اس لحاظ سے تو درست ہے کہ وہ آپ کا ہم آہنگ نہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اگر کوئی میرا ہمنوا نہ ہو تو میں اسے متعصب کہنے لگوں۔ ہو سکتا ہے کہ اگر آپ اس سے پوچھیں تو وہ شاید اپنے بیان کے ثبوت میں آپ سے زیادہ تاریخی حوالے پیش کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر طہٰ حسین نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک شخص ثالث کی حیثیت سے لکھا ہے اور تشیع یا تسنن سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ حضرت عمر اور ان کے دور خلافت کو اس نے کتنا سراہا ہے اور "الفتنۃ الکبریٰ" کے آغاز ہی میں صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ وہ نہ علویین کا طرفدار ہے نہ امویین کا بلکہ محض ایک غیر جانبدار شخص ثالث کی حیثیت سے مورخانہ گفتگو کرنا اس کا تنہا مقصد ہے۔

رہا میں سو میرے نزدیک شیعہ سنی کی مذہبی تفریق ہی سرے سے غلط ہے۔ نہ شیعوں کے اس اصول کو میں نے کبھی تسلیم کیا کہ امامت کوئی منصوص من اللہ بات ہے اور آل نبی کے لئے مخصوص ہو چکی ہے، کیونکہ اصولاً یہ اس جمہوریت کے تصور کے منافی ہے جسے اسلام نے پیش کیا اور جس کی رسول اللہ نے اپنے قول و عمل سے ہمیشہ تائید کی۔ اور نہ میں اہل تسنن کے اس خیال کا موید ہوں کہ اگر حضرات شیعہ پہلے تین خلفاء کو غاصب و ناجائز قرار دیتے ہیں تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ رسول اللہ کی رحلت اس وقت ہوئی جب دین کے تمام اساسی اصول مرتب ہو چکے تھے۔ (اکملت لکم دینکم) جن میں نہ رسول اللہ کی جانشینی کا مسئلہ شامل تھا اور نہ آپ کو اس کا علم تھا کہ آیندہ آپ کا جانشین کون ہوگا۔ اس لئے اس مسئلہ کو مذہب سے متعلق سمجھنا سخت غلطی ہے۔ یہ تمام جھگڑے سیاسی ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے انھیں دیکھنا چاہئے۔ اس میں کوئی بات نہ سنیوں کے برا ماننے کی ہے اور نہ شیعوں کی۔ لیکن دشواری تو یہی ہے کہ اگر کوئی شخص افراد بنی امیہ کے خلاف تنقید کرتا ہے تو یہ بات سنیوں کو اچھی نہیں معلوم ہوتی اور اسے وہ براہ راست مذہب پر حملہ کا مترادف سمجھتے ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص علوئیں کی غلطیوں پر اظہار خیال کرتا ہے تو شیعی حضرات خفا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان تمام باتوں کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ محض تاریخ سے ہے اور اسی حیثیت سے اسے دیکھنا چاہئے۔

تین اہم کتابیں

تدریس اردو
اردو تدریس پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی عالمانہ تصنیف جو زبان کی تعلیم و تدریس کے جدید ترین اصول و قواعد اور تازہ ترین قومی مسائل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ قیمت:۔ ۴ روپے

اردو رباعی
ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ جس میں اردو فارسی ادب کی تاریخ میں پہلی بار رباعی کے فن، موضوع اور ارتقاء پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت:۔ ۵ روپے

تحقیق و تنقید
تحقیقی و تنقیدی مقالات کا مجموعہ جس میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے زبان و ادب کے نہایت اہم اور نئے موضوعات و مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ قیمت:۔ ۳ روپے

باب الاستفسار

(۱)

کیمیا۔ سیمیا و ریمیا وغیرہ

(جناب فضل الرب صاحب۔ گوجرانوالہ)

میں نے بعض کتابوں میں علم کیمیا کے ساتھ اسی وزن کے اور پوشیدہ علوم کے نام بھی دیکھے ہیں۔ جیسے ہیمیا و سیمیا وغیرہ۔ لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ ان علوم سے کیا مراد ہے۔ مہربانی فرما کر ان کی صراحت فرما دیجئے، نیز یہ کہ کیا کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس میں ان علوم کا ذکر کیا گیا ہو۔

(نگار) جن علوم کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ انھیں "علوم خمسہ محتجبہ" بھی کہتے ہیں (یعنی پانچ پوشیدہ علوم) ان پانچ علوم کے نام یہ ہیں۔ (۱) کیمیا (۲) لیمیا (۳) ہیمیا (۴) سیمیا (۵) ریمیا۔

علم کیمیا سے مراد وہ علم ہے جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ معمولی دھاتوں کو کیونکر قیمتی دھاتوں میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ جیسے چاندی کو رنگ دے کر سونا بنا دینا۔ یا پارہ کو منجمد کر کے چاندی بنا دینا وغیرہ۔ اس کو نہوتی بھی کہتے ہیں اور اس فن پر متعدد کتابیں اکابر علم و فضل نے لکھی ہیں۔ مثلاً جلدکی، مجریطی۔ خالد ابن یزید۔ طغرائی اور مولانا رومی جن سے یہ شعر بھی منسوب ہے ؎

کیمیا و سیمیا و ریمیا　　　این نداند جز بذات اولیا

لیمیا: یہ طلسماتی علم ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ علوی و سفلی قوتوں کی مدد سے کیونکر بہت سے عجائبات طلسمی دکھائے جا سکتے ہیں۔

ہیمیا: جس کا دوسرا نام علم تسخیر بھی ہے۔ جیسے موکلوں یا جنات پر قابو پالینا اور ان سے کام لینا۔ اس علم کا تعلق افسوں خوانی، ادھر گنڈا تعویذ وغیرہ سے ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض حضرات ادعیۂ ماثورہ کے ساتھ رد بلا کے لئے سیفی بھی پڑھتے ہیں اس کا تعلق بھی اسی سے ہے۔

سیمیا: اس علم کا تعلق تصور و خیال، ارادہ و توجہ کی قوت سے ہے اور یہ تقریباً وہی ہے جسے مسمریزم یا قوت مقناطیسی کہتے ہیں۔

ریمیا: اس کا دوسرا نام علم نیرنجات بھی ہے اور علم شعبدہ بھی۔ اس کا تعلق زیادہ تر ہاتھ کی صفائی اور نظر فریبی سے ہے

علم سیمیا و ریمیا پر بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن کے مصنفین میں خسرو شاہ، ابن عراقی۔ ابو عبید اللہ مغربی (مصنف سحر العیون) ۔ حکیم ابو القاسم (مصنف عیون الحقائق و انفاح الطرائق) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ علوم دراصل اہلِ یونان کے ہیں اور انھیں کی کتابوں سے بعض علمائے اسلام نے بھی استفادہ کیا ہے۔

ایک کتاب انھیں علوم پر "اسرار قاسمی" کے نام سے عرصہ ہوا بمبئی میں چھپی بھی تھی۔ جسے ملا حسین واعظ کاشفی کی تالیف ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا نام اسرار قاسمی اس لئے رکھا گیا کہ وہ سید قاسم الانوار کے نام معنون کی گئی تھی۔

---

(۲)

بعض فارسی اشعار کی تشریح

(حافظ عباد اللہ فاروقی۔ لاہور۔ ایم۔ اے (فلسفہ) ایم۔ اے (فارسی)

تسلیم و نیاز۔ مندرجہ ذیل اشعار تشریح طلب ہیں۔ نگار کے آئندہ شمارہ میں ان کا مفہوم واضح کر کے ممنون فرمائیے گا۔

(۱) ؎ نظرِ قضا نداند کہ قدر چوں نقشِ عنقا
بہ صحیفہ ارادت بکجا نوشت ما را (امام بخش صہبائی)

---

(۲) مندرجہ ذیل اشعار میں "دلِ تنگ" سے کیا مراد ہے؟

؎ بشوای نقشِ دلِتنگی کہ در بازارِ یک رنگی
نعیمہائے گوناگوں نے احمر نے ارزد (حافظ)

؎ ز سوزِ دلِ تنگم اے ہجر مگذریں شور
بر بوئے کباب آید آں مستِ شراب من (امیر خسرو)

؎ دلِ تنگ عیش ما را کہ شمار دار رضواں
کہ ہزار زخم دنداں جگرش نگار دارد (عرفی)

---

(۳) خواجہ حافظ اپنے بعض اشعار میں اپنی مخصوص اصطلاحات مثلاً "سُبک روح" "مئے دو سالہ" وغیرہ کا بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ جو توضیح طلب ہیں۔ اول الذکر اصطلاح میں تکرار لفظی ہے آخر الذکر میں "دو سالہ" کی خصوصیت واضح نہیں ہو سکی۔ جبکہ شراب جتنی پرانی ہو زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ والے کبھی صد سالہ شراب کے مٹکے بڑی حفاظت سے رکھا کرتے تھے۔ آج بھی اُن کے ہاں مئے کہنہ کو خصوصیت حاصل ہے۔

اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ بنوش مے چو سبک رُوحی اے حریف مدام
علی الخصوص دراں دم کہ سرگراں داری　　(حافظ)

؎ درسبک رُوحی مثل بود ند طاعت پشیگاں
تازمصلائے ریا بہر دوش کس بارے نبود　　(عرفی)

مئے دو سالہ

؎ مئے دو سالۂ و محبوب چہاردہ سالہ　　ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر　　(حافظ)

؎ چہل سال رنج و غصّہ کشیدیم و عاقبت
تدبیر ما بدستِ شراب دو سالہ بود　　(حافظ)

؎ منم کہ آب گُل و رنگ لالہ مے طلبم
دریں لباس شراب دو سالہ مے طلبم　　(عرفی)

(نگار) (۱) صہبائی کے دیوان میں یہ شعر موجود نہیں بہر حال جس کا بھی ہو اس میں آپ نے پہلے مصرع میں چوں (بمعنی جب) ... ہے حالانکہ لفظ چو ہونا چاہئے (بمعنی مثل) یعنی نقش عنقا کے مانند۔

اس شعر میں تین لفظ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ قضا - قدر - ارادت - قضا کہتے ہیں امر الٰہی کو، قدر سے مراد ہے وہ بات جو امر الٰہی کے تحت مقدر یا مقرر ہو چکی ہے۔ ارادت کے معنی ہیں طاعت و رغبت کے۔ علاوہ اس کے یہ بھی سمجھ لینا ہے کہ لفظ قدر فاعل ہے۔ نوشت کا، اور اس صورت میں شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس طرح نقش عنقا معدوم ہے اسی طرح صحیفۂ ارادت یا صحیفۂ مستندان میں میری تحریر مقدر کا بھی حال معلوم نہیں۔ خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میرا انجام ہونا ہے۔

---

(۲) دل تنگ سے مراد ہے وہ دل جو ملول و ناخوش ہو اور دل تنگی نام ہے کیفیت حزن و ملال کا۔

(الف) حافظ کہتا ہے یہ خیال چھوڑ دے کہ بازار یکرنگی یا بے ریائی میں گوناگوں نعمتوں کے مقابلے میں شراب کی چیز نہیں۔ بلکہ دراصل شراب ہی تنہا وہ چیز ہے جو دنیا میں یکرنگی یک جہتی اور صدق و خلوص کی کیفیت پیدا کر سکتی ہے۔

(ب) خسرو کہتا ہے، کچھ پروا نہیں اگر میرے ملول و رنجیدہ دل کو جلا کر کباب کر دے۔ بشرطیکہ یہ بوئے کباب اس مست شراب (یعنی میرے محبوب) کو اپنی طرف مایل کر سکے۔ چونکہ شراب پینے کے بعد خواہش کباب تیز تر ہو جاتی ہے اس لئے خسرو نے اسی خیال کو سامنے رکھ کر یہ شعر لکھا ہے۔

(ج) عرفی کا اصل شعر یوں ہے:-

دلِ خوں گرفتۂ من کہ شمارد از صبوراں
کہ ہزار زخم دنداں جگرش فگار دارد　　مفہوم ظاہر ہے۔

(۴) (۱) حافظ کے شعر میں نہ تکرار لفظی ہے نہ تکرار معنوی۔ آپ نے "سبک روحی" اور "مئے دو سالہ" کو مترادف سمجھا ہے، حالانکہ یہ دونوں لفظ اپنا اپنا مفہوم بالکل جدا رکھتے ہیں۔ مے اور سبکروحی دونوں کو ہم معنی سمجھکر یہ اُلجھن آپ کو پیدا ہوئی ہے کہ جب مے اور سبکروحی دونوں ایک چیز ہیں تو پھر "نبوش مے چو سبکروحی" کہنا بیکار سی بات ہے۔ حالانکہ چو سبکروحی کا مفہوم ہے۔ "چوں سبک روح باشی" اور سبک روحی لغات اضداد میں سے ہے جس کے معنی شگفتگی ولطافت کے بھی ہیں اور دلگرفتگی وبے یقینی کے بھی اس لئے کہ حافظ اپنے حریف سے کہتا ہے کہ اگر تو کسی وقت بے یقینی اور سر گرانی کی کیفیت محسوس کرے تو شراب پینا شروع کردے۔

(ب) عرفی کے اس شعر میں "سبک روحی" دل شگفتگی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، مفہوم بہت صاف ہے۔

(ج) حافظ نے جہاں جہاں "شراب دو سالہ" کا فقرہ استعمال کیا ہے، اس سے مراد شراب کہنہ ہی ہے جو زیادہ لطیف ہوتی ہے۔ کیونکہ حافظ کے عہد میں دو سال کی رکھی ہوئی شراب کو بھی بہت کہنہ سمجھتے تھے۔ موجودہ عہد کو سامنے رکھئے کہ اب تو ایک ایک سو سال تک شراب کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ آپنے چل اور چاردہ کی جگہ چہل اور چہاردہ لکھا ہے یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

نیاز نمبر

جس میں تقریباً پاک وہند کے سارے ممتاز اہل قلم اور اکابر ادب نے حصّہ لیا ہے۔ اس میں نیاز فتحپوری کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو مثلاً ان کی افسانہ نگاری، تنقید اسلوب نگارش، انشاء پردازی، مکتوب نگاری، دینی رجحانات۔ صحافتی زندگی، شاعری وادارتی زندگی، ان کے افکار وعقائد اور دوسرے پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کر کے ان کے علمی وادبی مرتبے کا تعین کیا گیا ہے۔ گویا یہ نمبر حضرت نیاز کی شخصیت اور فن کا ایسا مرقع ہے جو اس سلسلے میں ایک مستند دستاویز اور اردو صحافت میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

صفحات:۔ ۶۲۴ — قیمت:۔ آٹھ روپے

نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

منظومات

پھولوں کی رانی

(جبوب الرحمان۔ وامق عظیم آبادی)

تھی ہر سمت ایسی لطافت کی بارش — کہ ہر ذرہ تھا دعوت صد نمایش
جدھر دیکھئے جلوہ گر چاندنی تھی — فضا گویا اک مستقل روشنی تھی
کہ آئی نظر ایک پھولوں کی رانی — ہمہ آفت جاں، ہمہ دل ستانی
ردائے صباحت میں یوں مستتر تھی — سراپا وہ گویا سحر ہی سحر تھی
ز سر تا قدم بس تناسب کا پیکر — عیاں گویا مرمر میں شہکار آذر
وہ اڑتی ہوئی سر سے بالوں کی خوشبو — تھا بکھرا ہوا مشک رم خوردہ آہو
وہ بھرپور اس کی ابھرتی جوانی — سراپا تماشہ، ہمہ لنترانی
وہ لب رہ گئی تھی شفق جن میں ڈھل کے — برابر کے مصرعے تھے گویا غزل کے
وہ آنکھوں کی رنگینی و آب و تاب — کوئی بھر دے ساغر میں جیسے شراب
تبسم تھا یا عکس صبح گلستاں — تکلم تھا یا سحر بابل پرافشاں
محبت سے لبریز نیچی نگاہیں — دیار جنوں کی کھلی درسگاہیں

پیام محبت دیا جا رہا تھا
خراج عقیدت لیا جا رہا تھا

(عقت کاظمی)

امید ہے ترے دل میں اتر گیا ہوگا — زبان شوق نے جو لفظ کہہ دیا ہوگا
ترے دیار سے چل کر کوئی کہاں جاتا — ترے دیار کی راہوں میں کھو گیا ہوگا
غم حیات نے فرصت نہ مل سکی جبکو — وہ بدنصیب جیا بھی تو کیا جیا ہوگا
غم فراق کے مارے تڑپ اٹھے ہونگے — خیال جب تری محفل کا آگیا ہوگا

وہ صحبتیں نہ رہیں جب تو کاظمی شاید
مجھے بھی دل سے کسی نے بھلا دیا ہوگا

(سید فضا جالندھری)

رنگ ہر پھول کے چہرے سے اُڑا جاتا ہے
تم کو لازم نہ تھا گلشن میں خراماں ہونا

آہ اب پوچھتے ہو میری تمنا مجھ سے
ہو چکا تم سے علاجِ غمِ پنہاں میرا

ذرّے ذرّے پر ہے چشمِ جستجو
آگیا راہِ طلب میں یاد کیا
دیکھ لو حالِ دلِ حسرت نشاں
نامرادِ عشق کی رُوداد کیا

پھولوں سے فردوس ہو گلشن یا کانٹوں سے دشت بنے
اُس طائر کو ان سے غرض کیا جس سے نشیمن چھوٹ گیا
بانٹ لئے کچھ کانٹوں نے کچھ دشتِ جنوں کی نذر ہوئے
رفتہ رفتہ پائے طلب کا اک اک چھالا پھوٹ گیا

کہو اے ہمصفیرانِ گلستاں تم پہ کیا گزری
ہمارے بعد سنتے ہیں کہ رنگِ گلستاں بدلا

دل میں ہیں جلوہ گر مگر آتے نہیں نظر
اتنے قریب رہ کے بھی ہیں کتنی دور آپ

(سید حرمت الاکرام)

کسے بتائیں کہ تھا جن پہ نازشِ راز حیات
اُنھیں کو اہلِ زمانہ نے کم نظر جانا
تمھیں بتاؤ کہ اس کا جواب ہم کیا دیں
کہ اہلِ درد نے کیوں تم کو چارہ گر جانا
حریف کوہ کنی میں بھی ہوں مگر حرمت
خود اپنے تیشہ سے آیا نہ مجھکو مرجانا

ے حفیظ نعیمی)

حیات اشکِ الم بن گئی تو کیا ہوگا
نہ تم سے چھٹ کے کٹی زندگی تو کیا ہوگا

کرو نہ وعدہ بایں سادگی قسم کھا کر
کہیں جو مجھ کو ہنسی آگئی تو کیا ہوگا

سمن کدوں میں، خبر ہے، بہار آئے گی
کلی نہ دل کی مگر کھل سکی تو کیا ہوگا

ابھی تو غم کو سہارا ہے موت کا لیکن
نہ آئی وقت پہ گر موت بھی تو کیا ہوگا

جو شمع بزم سے تیری جلا کے لایا ہوں
وہ جھلملا کے اگر بجھ گئی تو کیا ہوگا

میں اپنا گھر بھی جلا لوں گا روشنی کیلئے
مگر نہ جب بھی مٹی تیرگی تو کیا ہوگا

لئے تو جاتے ہیں اس بزم میں نعیمی کو
زباں نہ اسکی وہاں بھی کھلی تو کیا ہوگا

اُن سے کہہ دیا کس نے رازِ دل خدا جانے
کیوں وہ اس قدر مجھ سے اب لگے ہیں شرمانے

غالباً کوئی میکش گلستاں سے گزرا ہے
شاخِ گل کے ہاتھوں میں دے گیا ہے پیمانے

چاند سے، ستاروں سے، گل سے کر دئے منسوب
تیرے راز کی خاطر، میں نے تیرے افسانے

آپ کی جبیں پر کیوں آگیا پسینہ سا
فطرتاً چراغوں پر گرتے ہی ہیں پروانے

حالِ غم نعیمی سے اس طرح تو مت پوچھو
آنہ جائیں پلکوں پر غم گزیدہ افسانے

ہوتی ہے کچھ آہٹ سی کبھی پاس، کبھی دور
اے عہد شکن یہ تیرا پیماں تو نہیں ہے

کچھ یادیں ہیں، کچھ زخم ہیں، کچھ داغ ہیں دلمیں
بے مایہ سہی دل تہی داماں تو نہیں ہے

محرومِ تبسم ہیں گل و غنچہ ابھی تک
یہ خوابِ بہاراں ہو، بہاراں تو نہیں ہے

کچھ تار ملے تو ہیں سرِ خارِ مغیلاں
پوچھو یہ نعیمی کا گریباں تو نہیں ہے

جو شمعیں خود اک دن بجھا کر گئے تھے
اب آئے ہو کیوں تم انھیں کو جلانے

وہ عنوان بخشا کئے مسکرا کر
میں لکھتا رہا آنسوؤں سے فسانے

مریضِ محبت کی ہو خیر یارب
وہ آنکھیں ہیں کیوں آج نمناک جانے

انھیں بھول جاؤں یہ چاہا تھا لیکن
نعیمی یہ کمبخت دل بھی تو مانے

مطبوعاتِ موصولہ

عرب قبل اسلام

تصنیف :- مولانا ذکا اللہ دہلوی   مقدمہ :- سیّد ابوالخیر کشفی
ناشر :- طاہرہ کتاب گھر، ۲۰ موٹن بلڈنگ بندر روڈ کراچی - صفحات :- ۱۰۴ قیمت ایک روپیہ

ہمارے یہاں مولانا ذکا اللہ کا نام، عموماً ایک مورخ کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔ وہ بھی "تاریخ ہندوستان" کے سبب جس کے ۱۸ حصّے تقریباً آٹھ ہزار صفحات پر مشتمل ہیں لیکن اس کے سوا بھی اُن کی کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ اسلامیات کے عالم، عربی فارسی کے نباض، ریاضی کے فارغ التحصیل استاد، اچھے مقالہ نگار، اور بلند پایہ مترجم تھے۔ اور ان میں سے ان کی کوئی حیثیت ایسی نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ افسوس کہ ہم نے ان کی طرف وہ توجہ نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے اور شاید اسی لئے مولانا حامد حسن قادری کے لفظوں میں "اُن کی تصانیف کی طباعت و اشاعت اور قدر دانی و فیض رسانی کم سے کم ہے" ورنہ سرسیّد، آزاد، نذیر احمد، حالی و شبلی کے ناموں کی طرح، ان کا نام بھی حلقۂ خاص سے نکل کر دربارِ عام تک پہنچ جاتا۔

طاہرہ کتاب گھر۔ کی یہ سعی بہرحال مشکور رہے گی کہ اس نے اپنے اشاعتی پروگرام میں مولانا ذکا اللہ کی نادر تصانیف کو شامل کر کے عہدِ حاضر کو اُن کی ذات و صفات سے تعارف و وابستگی کا موقع دیا۔ زیرِ نظر کتاب، بقامت کہتر سہی بقیمت بہتر، کے مصداق اپنے موضوع پر درجہ استناد کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد صاحبِ کتاب سے ہماری دلچسپی بڑھتی ہے اور اس طرح کہ ہم ذکا اللہ کی زندگی و شخصیت کے باب میں شدید تشنگی محسوس کرنے لگتے ہیں اُردو کے ممتاز ادیب سید ابوالخیر کا فکر انگیز و معلومات افزا، مقدمہ ہماری اس تشنگی کو رفع کرتا ہے۔ کشفی صاحب نے صاحبِ تصنیف کی شخصیت کے ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس انداز سے کہ یہ مقدمہ مولانا ذکا اللہ کی زندگی و فن کا محض تاریخی خاکہ نہیں رہا بلکہ تخلیقی ادب کا ایک حصّہ بن گیا ہے۔

اسکولوں اور کالجوں کے لئے کتب خانوں کی تنظیم

مصنف :- صادق علی خاں - ایم - اے - ڈی - ایل - سی -
ناظم کتب خانہ جامعہ تعلیم ملی ملیر کراچی
ناشر :- فیروز سنز لمیٹڈ کراچی -

"کتب خانہ" کتابوں کے انبار کو نہیں کہتے، کتب خانہ نام ہے کتابوں کی ترتیب و تنظیم کا۔ ایسی ترتیب و تنظیم، جو کتب خانے میں داخل ہوتے ہی ہماری مطلوبہ کتابوں کے صفحے، ہمارے سامنے کھول دیتی ہے اور اس طرح کہ کتب خانہ ہمیشہ کے لئے ہمارے مطالعے کا مرکز بن جاتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے کتب خانوں میں یہ ترتیب و تنظیم نظر نہیں آتی۔ کتاب،

کتب خانے میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن بدنظمی کے سبب وہ ضرورت پر نہیں ملتی، ہم مایوس ہو کر واپس آتے ہیں، مایوسی کی تکرار اکثر ہم سے مطالعہ کا حوصلہ چھین لیتی ہے۔ اور ہم وقت ضائع ہونے کے خیال سے، پھر کبھی کتب خانے کا رُخ نہیں کرتے۔ ایسی صورت میں، کتب خانوں کی تنظیم پر، درجہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے لیکن افسوس کہ اس مشکل سے آسان گذرنے کی راہیں بھی ہمارے یہاں ہموار نہیں ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اکثر کتب خانے کسی تنظیم و ترتیب کے بغیر بے ہنگم طریقے سے کام کر رہے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں صادق علی خاں نے کتب خانے کے انھیں مسائل کو نظر میں رکھ کر، کتب خانے کے نظم و نسق پر بحث کی ہے۔ ہر چند کہ یہ بحث اسکولوں اور کالج کے کتب خانوں تک محدود ہے لیکن عام کتب خانوں کی ترتیب و تنظیم میں بھی یہ کتاب ہر طرح معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ مصنّف نے اس میں کتب خانے کے تقریباً سارے اہم مسائل مثلاً کتب خانے کے مقاصد، مہتمم کتب خانہ اور اس کا دائرہ عمل مجلس کتب خانہ اور اس کا طریقہ کار، کتب خانہ کی عمارت اور ضروری سامان حصول کتب اور عمل، کلاسیفکیشن کیٹلاگنگ، اجراء کتب اور حفاظت کتب سب پر جامع بحث کی ہے۔ یہ بحث چونکہ زبان و بیان کی صفائی و سادگی بھی رکھتی ہے اسلئے، عام و خاص دونوں یکساں استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۰۱ صفحات کی یہ کتاب سفید کاغذ پر، ستھری طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور دو روپیہ پچھتّر پیسے میں مل سکتی ہے۔

اردو ڈائجسٹ
سالنامہ ۱۹۶۵ء

اُردو ڈائجسٹ نے ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور الطاف حسن قریشی کی اِدارت میں، ایک ماہنامہ کی حیثیت سے اردو صحافت کی تاریخ میں ایک قابلِ قدر روایت کی بنا ڈالی ہے۔ یہ روایت ادب اور زندگی کی بہتر قدروں سے مربوط ہے۔ اس میں مستقبل کی تابناکی، حال کی آرائش اور ماضی کی عظمت کا احساس ملتا ہے۔ ایسا احساس جو محض مادی ترقیوں سے آسودہ نہیں ہوتا بلکہ روحانی مسرت کے سرچشموں کی تلاش میں بھی رہتا ہے۔

اردو ڈائجسٹ جیسا کہ اس کے متنوع دلچسپ مضامین سے نمایاں ہے، اپنے قارئین کو وہی کچھ دیتا ہے جو کچھ وہ چاہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی سطح کو کسی خاص قاری کی ذہنی سطح کا پابند کر دیتا ہے۔ وہ اپنے قارئین کو زبردستی کھینچ کر، کسی بلند سطح پر لا کھڑا کر دینے کا بھی قایل نہیں ہے۔ ہاں وہ قارئین کی نفسیات اور عام دلچسپیوں کا لحاظ رکھ کر اپنی ذہنی غذا ضرور فراہم کرتا ہے کہ پڑھنے والوں کی ذہنی سطح رفتہ رفتہ خود بخود بلند سے بلند تر ہوتی رہے

زیر نظر شمارہ دو روپے پچاس پیسے میں کسی بھی بک اسٹال سے مل سکتا ہے

اُلٹ پھیر

مصنّف :- شوکت تھانوی

ناشر :- اکرام احمد، مالک مشتاق بک ڈپو شلڈن روڈ کراچی ملے

"اُلٹ پھیر" اُردو کے ممتاز صحافی، ادیب، افسانہ نویس، شاعر اور مزاح نگار شوکت تھانوی مرحوم کے ڈرامانما ریڈیائی فیچرز کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی صحافتی و ادبی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اس کے مضامین اگرچہ بار بار سنے جا چکے ہیں پھر بھی اُن کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ بچے، لڑکے، نوجوان، طلبہ، طالبات

بوڑھے اور ادھیڑ، سب کی دلچسپی کا سامان ان میں موجود ہے۔ اور غالباً اسی ہمہ گیر دلچسپی کے سبب انھیں پاک و ہند کے ہر طبقہ میں حد درجہ سراہا گیا ہے۔

اس مجموعے کے مضامین، صرف یہی نہیں اپنے موضوع کی رنگارنگی کے سبب قابلِ مطالعہ ہیں۔ بلکہ زبان و بیان کا وہ چٹخارہ جگہ جگہ ملتا ہے جو شوکت مرحوم کے انداز سے مخصوص اور جو ان کی شوخی و ظرافت سے مل کر اکثر جگہ دو آتشہ ہو گیا ہے۔ دلچسپ مکالمات کی برجستگی میاں بیوی کے باہمی جھگڑوں کی تصویر کشی اور سیرت و جذبات کی مرقع نگاری نے مضامین کو اور بھی دلکش بنا دیا ہے۔

کتابت اور طباعت پسندیدہ ہے، قیمت بھی تین روپیہ زیادہ نہیں ہے۔

حریرِ سنگ

شاہ حسن عطا کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ شاہ حسن عطا صاحب، اردو کے بالغ نظر اور وسیع المطالعہ ادیب ہیں اور مختلف موضوعات پر ان کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ کی نظموں سے اُن کی قادر الکلامی اور جدتِ طبع دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ پہلی خصوصیت، ان میں عربی و فارسی سے شغف کی بدولت ملی ہے اور دوسری خصوصیت میں تنوع کے آثار، مغربی علوم و فنون سے گہری دلچسپی کے باعث نمودار ہوتے ہیں۔

اس مجموعہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصنف نے ہر نظم سے پہلے، اس کا پس منظر بھی نثر میں واضح کر دیا ہے۔ اس وضاحت کے سبب نظم کا ہر موضوع اپنی پوری جزئیات کے ساتھ ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے اور نکات شعری کا لطف دے جاتا ہے۔

کتاب اچھی عمدہ طباعت کے ساتھ شائع کی گئی ہے اور چار روپیہ میں مل سکتی ہے۔

فنکار

حیدر آباد (سندھ) کا یہ ادبی جریدہ جس کا پہلا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ چراغ الہ آبادی اور نظر کامرانی کی مشترک ادارت میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ اور اس کی اٹھان روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔

لکھنے والوں میں اردو کے اکثر ممتاز ادیب و شاعر کے نام شامل ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ اس پرچے کی بیشتر مشمولات مطالعہ کے لائق ہیں لیکن اس میں جو چیز خصوصیت سے قاری کی توجہ کا مرکز بنتی ہے وہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی کا مضمون "چند علمی نکات" ہے۔ یہ مقالہ ہماری نظروں سے بعض پردے اٹھاتا ہے اور بعض پردوں کو اٹھانے کی جرأت بھی دلاتا ہے۔

پرچہ مکتبہ چراغ۔ لطیف آباد (حیدر آباد) سے پچھتر پیسے میں مل سکتا ہے۔

نظیر نمبر

جس میں نظیر اکبر آبادی کا مسلک، اس کا فارسی تغزل، ادبیات اردو میں اس کا فنی اور لسانی درجہ، اس کے امتیازات اور محاسن شعری، اس کا شاعری میں مقام صنائع و طبائع شعرا کا فرق، معاصرین کی رائیں۔ مستند ادبا کی موافقت و مخالفت میں تنقیدیں اور اس کی خصوصیات و انداز شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ قیمت، تین روپے

نگار پاکستان۔ ۳۲ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی نمبر ۳

فیوضِ یزدانی ترجمہ الفتح الربانی

تالیف :- حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ◉ ترجمہ :- حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم

حضرت محبوب سبحانیؒ کے مواعظ کا وہ بیش قیمت ذخیرہ جس نے ہزارہا مسلمانوں کی زندگیاں بدل دیں اور انہیں سچا مومن بنا دیا۔ اس کا عام فہم و سلیس، بامحاورہ اردو ترجمہ پاک و ہند کے مشہور عالم مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم نے عرصہ ہوا تحریر فرما کر طبع کرایا تھا جو عرصہ سے نایاب تھا دینی حلقوں میں اسکی ضرورت کا شدت سے انتظار تھا لہٰذا ہم نے اس بیش قیمت کتاب کو باقاعدہ شرعی طور پر اجازت حاصل کر کے درج ذیل خوبیوں کے ساتھ دوبارہ شائع کیا ہے۔ ایسی نایاب و عجوبہ روزگار کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے بیحد ضروری ہے :-

(۱) حضرت محبوب سبحانیؒ کے حالاتِ زندگی پر مشتمل مضمون شاملِ کتاب ہے
(۲) ایک کالم میں عربی متن و متقابل کالم میں بامحاورہ اردو ترجمہ
(۳) متن پر اعراب لگا دیئے گئے ہیں جس کی بیحد ضرورت تھی تاکہ ہر خاص و عام بہ آسانی پڑھ سکے۔
(۴) صحت کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔
(۵) کتابت و طباعت انتہائی خوشخط و معیاری ہے۔
(۶) کاغذ عمدہ گلیز سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۶۷۶ صفحات ٭ مجلد مع حسین گرد پوش

مندرجہ بالا خوبیوں کے باوجود ھدیہ انتہائی رعایتی و مناسب رکھا گیا ہے تاکہ ہر خاص و عام مستفید ہو سکے۔ ایسی نایاب و متبرک کتاب کے فوائد سے محروم رہنا انتہائی بدقسمتی ہوگی لہٰذا درج ذیل پتہ سے آج ہی طلب فرمائیے۔ ہدیہ مجلد مبلغ بارہ روپے ۱۲/- علاوہ محصول ڈاک

اصلاح الرسوم

ہمارے معاشرے میں مروجہ رسومات کی وجہ سے جس قدر خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں بیشتر رسومات کو تو لوگوں نے دین کے درجہ میں سمجھ رکھا ہے۔ ان خرابیوں کی اصلاح و غلط رسوم کے بندھن سے مسلمانوں کو آزاد کرنیکی غرض سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہ کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا مطالعہ ہر مسلمان کیلئے بیحد ضروری ہے۔ کاغذ عمدہ گلیز، کتابت و طباعت معیاری خوشخط، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۲۴۰ صفحات ٭ قیمت: دو روپیہ پچیس پیسے ۲/۲۵ ٭

رہنمائے دین مفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور محل مکلوڈ روڈ کراچی

خواتینِ اسلام

تصنیف:۔ مفتی انتظام اللہ شہابی

اسلام نے جہاں مردوں میں بہترین مجاہدین و اولیاء اللہ پیدا کئے ہیں وہیں خواتین میں بھی ایسی نامور ہستیاں پیدا کی ہیں جن کا ثانی دوسری اقوام میں ملنا ناممکن ہے۔ اردو زبان میں ایسی کتاب جس میں نامور خواتینِ اسلام کا مکمل تذکرہ ہو اس کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے حضرت مفتی صاحب نے کمرِ ہمت باندھی اور الحمدللہ اس کتاب میں انہوں نے ابتدائے اسلام سے لیکر موجودہ زمانے تک کی خواتینِ اسلام کے حالات بیحد جانفشانی سے مستند طور پر درج فرمائے ہیں۔ اِس کتاب کا مطالعہ جملہ مسلمانوں کے لئے عموماً اور خواتین کیلئے خصوصاً بیحد مفید و ضروری ہے۔ کتابت و طباعت انتہائی خوشخط و معیاری ہے۔ کاغذ عمدہ گلیز، سائز ۲۲ × ۱۸/۸ ضخامت ۴۳۰ صفحات۔ مجلّد مع حسین گرد پوش۔

قیمت چھ روپے

شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل

حضرت علامہ شاہ ولی اللہ رح کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ کون مسلمان ہے جو آپ کے مرتبے سے واقف نہیں، آپ نے تصوف جیسے نازک مسئلے کو اپنی کتاب "القول الجمیل" میں اس عمدگی سے حل فرمایا ہے جو اپنی نظیر آپ ہے۔ "شفاء العلیل" اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے تاکہ ہر مسلمان اس سے استفادہ حاصل کرسکے۔ تصوف سے واقفیت حاصل کرنے کیلئے اِس کتاب کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔

کاغذ عمدہ گلیز، کتابت و طباعت خوشخط و دیدہ زیب، سائز ۳۰ × ۲۰/۱۶ ضخامت ۲۰۸ صفحات دو رنگہ حسین سرورق۔ قیمت قسم اول عمدہ گلیز دو روپے: قسم دوم ایک روپیہ پچاس پیسے۔

رہنمائے دین مفت طلب کیجئے

مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور محل میکلوڈ روڈ کراچی

کنبہ کے تحفظ کے لئے ....

طریقہ نہایت آسان ہے :-

* پانچ روپے سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے۔

** پچاس ہزار روپے تک آپ اور آپ کے کنبے کا ہر فرد اپنے اکاؤنٹ میں رکھ سکتا ہے۔

*** سال میں سو دفعہ اکاؤنٹ سے بذریعہ چیک رقم نکالی جا سکتی ہے۔

****** جمع شدہ رقم پر ½۲ فیصد سالانہ منافع ملتا ہے۔

مکمل تفصیلات کے لئے ہماری کسی بھی شاخ سے رجوع کیجئے

دی مسلم
کمرشل
بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس
کراچی

ایس مصطفٰے اسمٰعیل
جنرل منیجر

JWT·64

MCB

اعلیٰ معیارِ خدمت ہی قابلِ لحاظ شے ہے

اور آپ

اسٹینڈرڈ بینک لمیٹڈ

پر

اعلیٰ معیارِ خدمت کیلئے

بجا طور پر بھروسہ کر سکتے ہیں

مشرقی اور مغربی پاکستان میں اس کی پھیلی ہوئی
تمام شاخوں کے ذریعہ بنکاری کی تمامتر سہولتیں حاصل ہیں
اس کے نمائندے دنیا کے تمام اہم تجارتی
مراکز میں موجود ہیں ۔

ہیڈ آفس:۔
محمدی ہاؤس
میکلوڈ روڈ
کراچی

12 5 63
ID30